

اشاعت کا ۹۶ واں سال
زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا ترجمان

ننگہ اور

۱۵ روپے

جولائی ۲۰۱۸ء

منور رانا
آصفہ زمانی، سلمیٰ حجاب
خوشگیر سنگھ شاد، امین احسن
شفیع ایوب، سببخ، مصر شوق
واسد یوموی، چھما شرما، مصطفیٰ علی

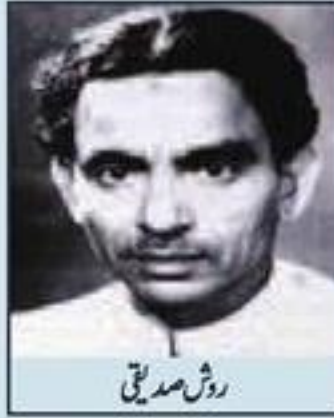
محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش



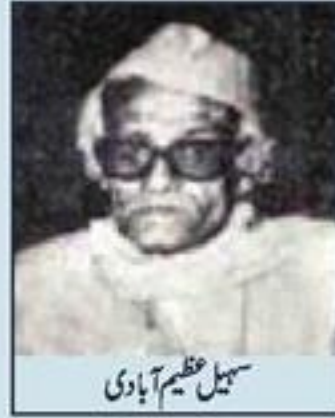
اردو کے مایہ ناز ادیبوں کی تاریخ پیدائش (جولائی)



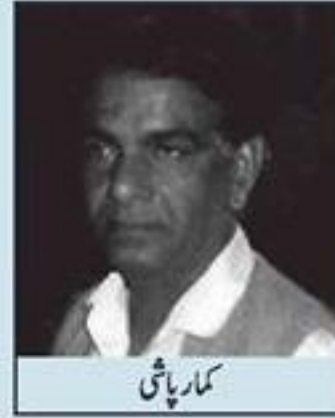
قمر رئیس



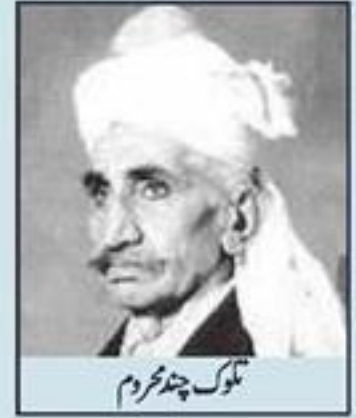
روش صدیقی



سہیل عظیم آبادی



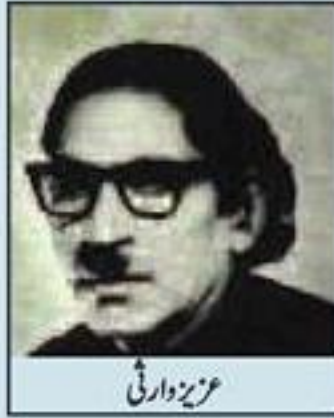
کمار پاشی



ملوک چند محروم



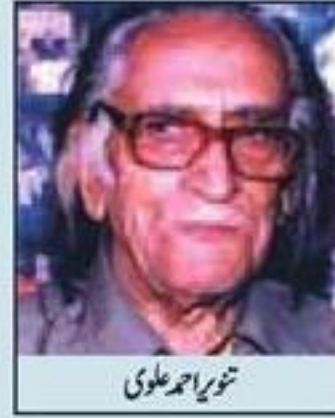
ملار موزی



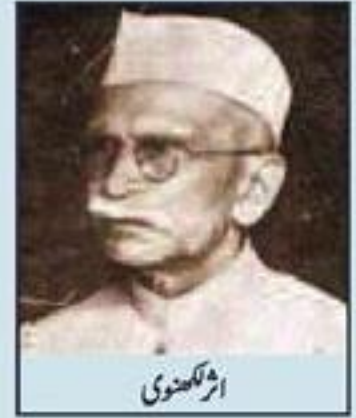
عزیز وارثی



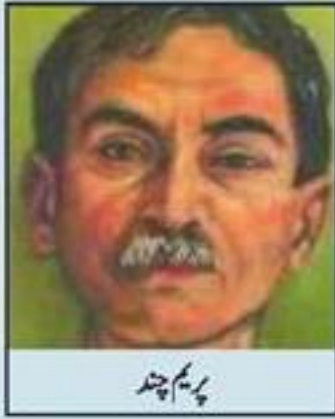
خورشید الاسلام



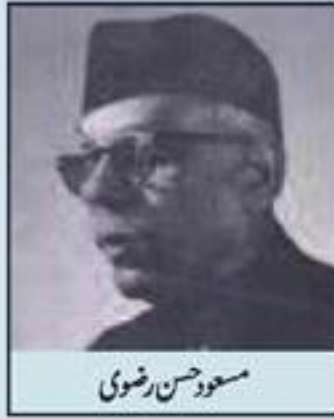
تنویر احمد علوی



اثر لکھنوی



پریم چند



مسعود حسن رضوی



عزیز اندوری



شائستہ اکرام اللہ



راج بہادر گوڑ

عزیز وارثی	۱۷ جولائی ۱۹۲۴	۲۹ جولائی ۱۹۸۹
اعجاز افضل	۲۰ جولائی ۱۹۳۶	یکم جنوری ۱۹۹۷
خورشید الاسلام	۲۱ جولائی ۱۹۱۹	۱۹ جون ۲۰۰۶
راج بہادر گوڑ	۲۱ جولائی ۱۹۱۸	۷ اکتوبر ۲۰۱۱
شائستہ اکرام اللہ	۲۲ جولائی ۱۹۱۵	۱۱ دسمبر ۲۰۰۰
عزیز اندوری	۲۳ جولائی ۱۹۳۲	۳۰ اکتوبر ۲۰۱۳
مسعود حسن رضوی	۲۹ جولائی ۱۸۹۳	۲۹ دسمبر ۱۹۷۵
پریم چند	۳۱ جولائی ۱۸۸۰	۸ اکتوبر ۱۹۳۶

ظہیر احمد صدیقی	۱۰ جولائی ۱۹۲۹	
ایم حبیب خاں	۱۱ جولائی ۱۹۳۱	۲ مارچ ۱۹۹۸
اثر لکھنوی	۱۲ جولائی ۱۸۸۵	۶ جون ۱۹۶۷
نازش پرتاپ گڑھی	۱۲ جولائی ۱۹۲۳	۱۰ اپریل ۱۹۸۳
قمر رئیس	۱۳ جولائی ۱۹۳۲	۲۹ اپریل ۲۰۰۹
محمد علی تاج	۱۳ جولائی ۱۹۲۶	۱۲ اپریل ۱۹۷۸
خضر برنی	۱۶ جولائی ۱۹۰۸	۲۸ فروری ۱۹۸۹
تنویر احمد علوی	۱۶ جولائی ۱۹۳۰	۲۰ فروری ۲۰۱۳
ملار موزی	۱۸ جولائی ۱۸۹۶	۱۰ جنوری ۱۹۵۲

ملوک چند محروم	یکم جولائی ۱۸۸۷	۶ جنوری ۱۹۶۶
سلام مچلی شہری	یکم جولائی ۱۹۲۱	۱۹ نومبر ۱۹۷۳
محمد حسن	یکم جولائی ۱۹۲۶	۲۵ اپریل ۲۰۱۰
کمار پاشی	۲ جولائی ۱۹۳۵	۱۸ نومبر ۱۹۹۲
سہیل عظیم آبادی	۵ جولائی ۱۹۱۱	۲۸ نومبر ۱۹۷۹
رمز آفاق	۸ جولائی ۱۹۱۳	۳۱ مئی ۲۰۰۲
صدیق مصبی	۸ جولائی ۱۹۳۱	۶ مارچ ۲۰۱۳
روش صدیقی	۱۰ جولائی ۱۹۰۹	۲۳ جنوری ۱۹۷۱
مصور سبزواری	۱۰ جولائی ۱۹۲۲	۱۲ جون ۲۰۰۲

نیا دور

ماہنامہ
جولائی ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجول کمار
ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن و رسالانہ

صبا عینی

فون: 7705800953

ترجمین کار: وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پبلیکیشنز، گولنج، لکھنؤ
شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش
زیر سالانہ: ۱۶۵/روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائریکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour
of Director, Information & Public Relations
Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

سلمیٰ حجاب



'بعد از خدا' کا
تجزیاتی جائزہ
صفحہ ۱۱

آصفہ زمانی



بے بدل فنکار
انور جلال پوری
صفحہ ۹

منورارانا



آج لگتا ہے کہ سچ
بول دیا ہے میں نے
صفحہ ۵

مرزا جعفر حسین



تعلیم و تربیت اطفال
صفحہ ۳۳

پرل ایس بک



دوسری زندگی
صفحہ ۳۹

سرخے مصر اشوق



واقعی بڑے قلم کار تھے
انور جلال پوری
صفحہ ۱۸

شفیع ایوب



انور جلال پوری
ایک طرحدار شخصیت
صفحہ ۱۳

خوشبیر سنگھ شاد



اب تو بس آواز
نی آواز ہے
صفحہ ۱۳

مصطفیٰ علی



ہاسٹل کا ہاتھ روم
صفحہ ۳۸

چھما شرما



اس کے سورج
چاند ستارے
صفحہ ۳۶

واسد یوموی



لاٹری
صفحہ ۳۵

امین احسن



زبان میر کا
غیر معمولی فنکار
صفحہ ۲۱

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مضمومات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اردو افسانہ اور نئی نسل

بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ نے گزشتہ دنوں دہلی میں ایک جلسہ میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو افسانے کی جانب نئی نسل کا رجحان کم ہے۔ ان کے مطابق نئے اردو افسانہ نگار جس تعداد میں سامنے آنے چاہئے، نہیں آ رہے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ اردو افسانہ نگاروں کی نئی نسل کہاں ہے اور کب آئے گی؟

اس بات کا اعتراف کئے نہیں ہوگا کہ اردو ادب پر ابھی بھی شعر اور شعری تنقید کا غلبہ ہے۔ ہم نیا دور کی اپنے تقریباً سو سال کی ادارت کا تجربہ بیان کریں تو بھی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ شعر اور شعری تنقید سے مبرا ہو کر اردو میں سوچنے سمجھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ ہم نے اسی شمارے کے اخیر کے صفحات میں اس بات کا افسوس کے ساتھ ذکر بھی کیا ہے کہ گزشتہ سو سال میں ادارہ نیا دور کو جو ۱۶۱ رکتا میں تبصرے کے لئے موصول ہوئیں، ان میں افسانوی مجموعے اور ناول ملا کر کل ۷۱ رکتا میں ہی آئیں جن میں بعض معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔

ایک عجیب سا مفروضہ چھوڑ دیا گیا ہے اردو والوں کے درمیان کہ شاعری دوسری تمام اصناف میں سب سے برتر ہے۔ فنی اور فکری اعتبار سے بھی اور مقبولیت کے معاملے میں بھی شاعری آگے ہے، لیکن دراصل ایسا قطعی نہیں ہے۔ اردو شاعری کو جب سے مشاہیر گلوکاروں کا ساتھ ملا، غزلوں کا بازار گرم ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے فلموں اور ٹی وی سیریلز کے پردے پر غزل چھا گئی۔ انٹرنیٹ کے آنے کے بعد غزل اور نظم کے ذریعہ اردو نے غیر اردو ادب طبقہ میں اپنی آمد ہی نہیں درج کرائی بلکہ ان سب کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا جن کا اردو سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، ہندوستان اور بالخصوص شمالی ہندوستان کی حد تک یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن ذرا باہر نکل کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ شیکسپیر سے لے کر میکسم گورکی اور وہاں سے گبرنیل گارسیا مارکیز تک اور ہندوستان کی بات کریں تو دور حاضر میں اروندھتی رائے، وکرم سیٹھ اور جھمپا لاہری تک جنہوں نے بھی قلم کے ذریعہ Celebrity کا درجہ حاصل کیا ہے ان میں اکثریت شعراء کی نہیں ہے۔ یعنی عالمی پیمانے پر نظم نہیں بلکہ نثر کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تاثر نہیں کہ اردو

واں طبقہ کی شعریت کے تئیں عقیدت کی حد تک محبت انہیں خاصہ نقصان بھی پہنچاتی رہی ہے کہ اردو میں عالمی معیار کی شاعری شاید نہیں ہوئی اور اگر ہوئی ہے تو اسے بین الاقوامی سطح

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء کا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ کے لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں۔

پر قبولیت حاصل نہیں ہو پائی، ایسا نہیں ہے کہ غالب سے لے کر فیض احمد فیض تک کے شعری ادب کے تراجم کو عالمی سطح پر جانچا پرکھا نہیں گیا۔ حالانکہ ہمارے درمیان مشتاق احمد یوسفی جیسے خلاق نثر نگار موجود تھے جن کے مزاح کو دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے نقادوں کی ستائش حاصل ہوئی۔ مختار مسعود کی نثر کی تعریف نہ کی جائے، یہ کیسے ممکن ہے۔ الطاف حسین حالی سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی، رجب علی بیگ سرور، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور نیر مسعود وغیرہ جیسے کتنے ادیب ہوئے ہیں جن کو عالمی ادب کے معیار پر پرکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی چند کو ہی عالمی شہرت نصیب ہوئی۔

رتن سنگھ صاحب اگر یہ شکایت کر رہے ہیں کہ نئی نسل کے افسانہ نگار کہاں ہیں، اس پر غور کرنا اشد ضروری ہے کہ کیا واقعی نئی نسل اردو افسانے سے نابلد ہے اور اگر ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اردو اداروں اور تعلیمی اداروں جہاں تنقید کو اکثر بے جا اہمیت دی جاتی ہے، انہیں اس جانب ضرورتاً متوجہ ہونا چاہئے کہ تخلیق ہی اصل ادب ہے اور نظم کے مقابلے نثر کو کمتر محسوس کرنا اچھی علامت نہیں ہے۔ بات مشتاق احمد یوسفی کی نکلی تو دل بیٹھ گیا کہ یوسفی

جون ۲۰۱۸ء سے نیا دور کی قیمت
۱۵ روپے فی شمارہ کے جریدی اضافے کے ساتھ
ذریعہ سالانہ ۱۶۵ روپے معین کیا گیا ہے

صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے اور 'عہد یوسفی' کا خاتمہ ہو گیا۔ ہمیں اس بات کا فخر تھا کہ ہم 'عہد یوسفی' میں جی رہے ہیں۔ اداسی اور ڈپریشن کے دوران ان کے مزاح نے ہمیں ہزاروں مرتبہ زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔ ان کی تحریروں نے ہمیں اور ہم جیسے لاکھوں لوگوں کو ہنساتے ہنساتے رلا دیا اور زندگی کے ابواب سے روشناس کرایا جو ہم یا ہمارے جیسے لوگوں کے تصور میں بھی نہیں تھے۔ ادارہ نیا دور ان کی

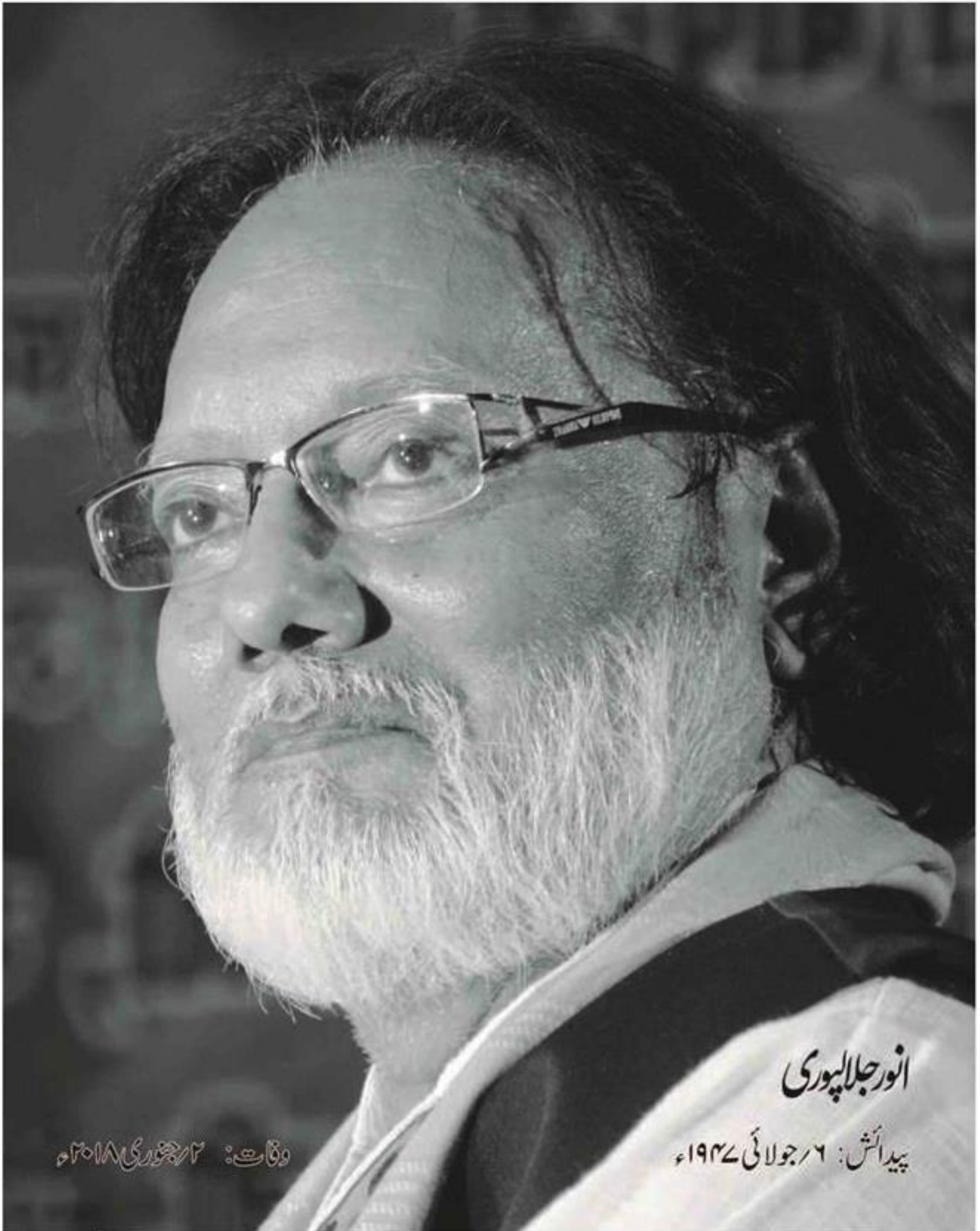
رحلت پر تعزیت پیش کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے انتقال کو ابھی کچھ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمیں گوپال داس نیرج نے بھی الوداع کہہ دیا۔ گنگا جمنی تہذیب کے صف اول کے علمبردار نیرج اردو اور ہندی کے بہترین نغمہ نگار تھے۔ فلموں میں ان کے بے شمار ایسے گانے مقبول ہوئے جن کی زبان صرف اور صرف اردو تھی۔ انہوں نے بارہا اس بات کا اقرار بھی کیا کہ اگر انہیں اردو نہ آتی ہوتی تو شاید وہ مقبولیت کی بلندیوں تک نہ پہنچ پاتے۔ اس شمارے میں انور جاوید پوری پر ایک گوشہ شائع کیا جا رہا ہے۔ انور جاوید پوری مشاعروں کے مشہور شاعر تھے ہی، ناظم مشاعرہ کے طور پر بھی ان کی مقبولیت کم نہ تھی لیکن مشاعروں میں شرکت اور شہرت کی وجہ سے ان کے علمی اور ادبی کاموں پر نگاہ کم ہی جاتی تھی۔ گزشتہ برس جب اردو شاعری میں گیتا (بھگوت گیتا کے منظوم اردو ترجمہ) کا اجراء ہوا تو اس جانب توجہ گئی۔ انہوں نے گیتا ہی نہیں، گیتا نگلی کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حمد و نعت کے علاوہ نثر بھی لکھی۔ وہ بھی ہماری گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شخصیت تھے۔

ہندوستانی ادب میں لیجنڈ کی حیثیت رکھنے والے اردو طنز و مزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین پر 'نیا دور' جلد ہی ایک شمارہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی طرہ دار شخصیت اور تہہ دار تحریروں پر مضامین درکار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ 'نیا دور' اپنے تمام سابقہ شماروں کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ستمبر ۲۰۱۸ء میں مجتبیٰ حسین نمبر بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم نے اعلان کیا تھا کہ جولائی کے شمارے میں پروفیسر مشیر الحسن کا مقالہ 'اردو زبان کی سیکولر روایت' شائع کیا جائے گا لیکن افسوس کہ اسے ہم حاصل نہ کر سکے۔ غالباً ۲۰۰۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے نظام لکچر میں پروفیسر مشیر الحسن نے یہ مقالہ پڑھا تھا۔ ہم خود وہاں موجود تھے لیکن دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

نیا دور کے سرورق کے اندرونی حصہ پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت و وفات سے متعلق شائع ہونے والا جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے ماخوذ ہے لہذا تاریخی اغلاط کے لئے 'نیا دور' کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔ قارئین 'نیا دور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء

www.information.up.nic.in

پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔



انور جلال پوری

پیدائش: ۶ جولائی ۱۹۴۷ء

وفات: ۲ جنوری ۲۰۱۸ء

انور جلالپوری

غزل

میں ہر بے جان حرف و لفظ کو گویا بناتا ہوں
کہ اپنے فن سے بھی پتھر کو آئینہ بناتا ہوں

میں انسان ہوں مرا رشتہ براہیم اور آزر سے
کبھی مندر، کلیسا اور کبھی کعبہ بناتا ہوں

مری فطرت کسی کا بھی تعاون لے نہیں سکتی
عمارت اپنے غم خانے کی میں تنہا بناتا ہوں

نہ جانے کیوں ادھوری ہی مجھے تصویر چھتی ہے
میں کاغذ ہاتھ میں لے کر فقط چہرہ بناتا ہوں

مری خواہش کا کوئی گھر خدا معلوم کب ہوگا
ابھی تو ذہن کے پردے پہ بس نقشہ بناتا ہوں

میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں صدا اخلاق کا پارس
اسی پتھر سے مٹی چھو کے میں سونا بناتا ہوں

انور جلالپوری

غزل

زلف کو ابر کا ٹکڑا نہیں لکھا میں نے
آج تک کوئی قصیدہ نہیں لکھا میں نے

جب مخاطب کیا قاتل کو تو قاتل لکھا
لکھنوی بن کے مسیحا نہیں لکھا میں نے

میں نے لکھا ہے اسے مریم وسیتا کی طرح
جسم کو اس کے اجنتا نہیں لکھا میں نے

کبھی نقاش بتایا کبھی معمار کہا
دست فنکار کو کاسہ نہیں لکھا میں نے

تو مرے پاس تھا یا تیری پرانی یادیں
کوئی اک شعر بھی تنہا نہیں لکھا میں نے

نیند ٹوٹی کہ یہ ظالم مجھے مل جاتی ہے
زندگی کو کبھی سپنا نہیں لکھا میں نے

میرا ہر شعر حقیقت کی ہے زندہ تصویر
اپنے اشعار میں قصہ نہیں لکھا میں نے

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔

پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 📌

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share>

گوشہ انور جلالپوری

میر ظہیر عباس روستمانی

0307-2128068 📞

@Stranger ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️ ❤️

آج لگتا ہے کہ سچ بول دیا ہے میں نے....



منور رانا

UGF-1، ڈھنگر اپارٹمنٹ، لال کنواں، لکھنؤ

موبائل: 9839050450

بہت بڑے تاجر شاعری سے بے انتہا شغف رکھنے والے رحمن صاحب کا قیام تھا، تقریباً روز آنا دوڑک لنگیاں ٹانڈا اور قرب وجوار سے کلکتہ آتی تھیں، ان کا شمار شہر کے صاحب ذوق رئیسوں میں ہوتا تھا۔ شاعروں ادیبوں کی دعوت کرنا ان کی مدد کرنا ان کے ساتھ وقت گزارنا رحمن صاحب کا ادبی مشغلہ تھا۔ ۵۶ نمبر عمارت بھی کئی تاریخی پہلوؤں کو چھپائے عمارتوں کی قطار میں کھڑی رہتی ہے، مشہور طوائف گوہر جان اسی عمارت میں قیام کرتی تھیں، اسی لئے اس کو گوہر بلڈنگ کہتے ہیں یہ وہی مشہور زمانہ رقاصہ گوہر جان تھیں جنکے سلسلے میں ان کی فرمائش پر اکبر الہ آبادی نے ایک شعر کہا تھا۔

دنیا میں کہاں ہے کوئی گوہر کے سوا
سب کچھ جسے حاصل ہے شوہر کے سوا
دو تین ملاقاتوں کے بعد انور بھائی سے میری دوستی ہو گئی حالانکہ صلاحیت، علم اور تجربے کے لحاظ سے انور جلال پوری کو اس دور کا بڑا شاعر یا دولت مند سیاست داں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہوا ایسا کچھ بھی نہیں۔ انور بھائی کی سیاسی گفتگو کی کڑیوں سے فیضیاب ہو کر کئی موجودہ سیاست داں ایوان حکومت کے راج سنگھاسن پر براہمان ہو گئے ان کی پر مغز اور معنی خیز تعریفوں کی بدولت کئی پتھر دل شاعروں نے دیوتاؤں کا روپ دھار لیا اور انور جلال پوری اس سنگ تراش کی طرح اپنے زخمی ہاتھوں کو دیکھتے ہی رہ گئے جس کی چھینی اور ہتھوڑی کی مسلسل ضربوں نے پتھر کے جگر کو چیر کر دیوتاؤں

سے ہندوستان دور تھا۔ لکھنؤ سے دیوا شریف تک مجھے کارڈ رائیو کرنے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ کیونکہ لکھنؤ سے بلکہ آپ سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ دیوا شریف آنے والا ہر راستہ مشاعرہ سننے والوں کے آنے والی بھیڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں سے تار بندھے ہوئے ہیں۔ سائیکل سوار بھی اپنے اپنے جتھوں کے ساتھ دیوا میلے کی طرف گامزن تھے، مشاعرہ گاہ میں بیٹھنے کی جگہ تو دور مشاعرے گاہ سے تقریباً سو فٹ پیچھے ہم اور ہمارے بھائی دو اینٹیں لے کر آئے اور ہم لوگ اسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ انور بھائی کی جوانی اور سرشاری کے عالم کا زمانہ تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ کسی شاعر کا تعارف کراتے ہوئے انور بھائی نے یہ شعر پڑھا تھا۔

اگر اے نا خدا طوفان سے لڑنے کا دم خم ہے
تو کشتی مت ادھر لانا یہاں پانی بہت کم ہے
لہجہ شگفتہ، گفتگو شاندار ادبی مذاق شائستگی کی خوبصورت شین قاف اوڑھے ہوئے یوں سمجھ لیجے کہ مشاعرہ نہیں تھا، ایک ایسی محفل یا ایک ایسی مجلس تھی جہاں ماؤں نے اپنے بچوں کو بھائیوں نے اپنے بھائیوں کو کتاب و قلم کے بغیر علم سیکھنے کے لئے بھیجا ہو، ظاہری بات ہے اس ہنگامے میں انور بھائی سے ملاقات بہت دشوار تھی اس مشاعرے کے بعد اگلے برس کلکتہ کے مشاعرے میں تشریف لائے وہاں ۵۶ نمبر لور چپ پور روڈ (جو اب راوند رسا بنی کہلاتا ہے) سی مارگ کی پہلی اور دوسری منزل پر ٹانڈا کے

کہیں پڑھا تھا کہ کچھ لوگ دوسروں کو ہمانے میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان کے اپنے ہونٹ مسکرانا بھول جاتے ہیں، کچھ ایسی ہی صورت حال انور جلال پوری کے ساتھ بھی رہی ہے۔ بھائی انور بھی ساری زندگی سادگی، شرافت اور دوست نوازی کی تلواریں دوسروں کی حفاظت کرتے رہے، اور خود قتل ہوتے رہے۔ مشاعروں کے اسٹیج سے انہی محفلوں تک انور جلال پوری نے اپنے دوستوں ہی نہیں دشمنوں کی بھی اتنی تعریف کی ہے کہ انھیں اپنی شخصیت اور شاعری کو سنوارنے کا باقاعدہ وقت ہی نہیں مل سکا انھوں نے کسی کو بھی سلام کرنے اور تعریف کرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وہ رواداری اور بے نیازی ہے کہ ان کا ناک نقشہ فقیروں اور درویشوں سے ملتا جلتا ہے، یہی وہ خاکساری ہے، جو بندے کو خدا سے قریب کر دیتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے، جو انسان کو اشرف المخلوقات ثابت کر دیتی ہے۔

ہماری عمر کے تقریباً سبھی شعرا و ادیب اور نثر نگار انور بھائی کو اپنا دوست یا ہم عمر بتاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، انور بھائی سے میرا پہلا رشتہ سامع اور شاعر والا تھا، دیوا شریف میلے کا مشاعرہ تھا، اتفاق سے میں آیا ہوا تھا۔ ان دنوں میرا مستقل قیام کلکتہ میں تھا۔ میرے چھوٹے سالے جنھیں شاعری سے شغف بھی ہے، وہ بھی مشاعرے کے بڑے شوقین ہیں۔ ہم لوگ دیوا شریف کے میلے میں ہونے والا مشاعرہ سننے کے لئے گئے، اُن دنوں ٹی وی کے لعنت

کے وجود کو یقین کی دولت بخشی۔ آج بھائی انور اس کوزہ گر کی طرح اپنے ہاتھوں میں لگی مٹی کو چوم رہے ہیں۔ جس نے ہنر کوزہ گری کو نور بخشے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میلے کر لئے۔ بھائی انور نے جس پڑھے لکھے شاعر کی تعریف کی، اسی نے انھیں نقیب مشاعرہ اور مشاعرے کا شاعر کہہ کر ان کے قد کو گھٹانے کی کوشش کی۔ جن شعرا کو ذرے سے آفتاب بنانے میں بھائی انور لبو لہان ہو گئے انھوں نے بھی ان کو ایک سرائے یا زیادہ سے زیادہ مغل سرائے سمجھ کر چھوڑ دیا۔ حالانکہ بھائی انور کی شخصیت سرائے نہیں، بلکہ حویلی جیسی ہے، ایک ایسی پرسکون حویلی جہاں بیٹھے پانی کا کنواں بھی ہے اور ٹھنڈے دالانوں والے کمرے بھی، کمرے میں روشن چراغ بھی ہیں، جن کی روشنی میں اردو کبھی اپنے گیسو سنوارتی ہے، کبھی اپنے اداس چہرے پر مسکراہٹ کی نقاب ڈالتی ہے۔ یہ حویلی جیسی پرسکون شخصیت اپنے اسلاف کے تہذیبی سرمائے کی حفاظت بھی کرتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے غزل کی ایک ایسی درس گاہ بھی تیار کرتی ہے، جہاں بیٹھ کر نئی نسل علم و ادب کی دولت سے مالا مال بھی ہو اور اپنے بزرگوں کے ادبی کارناموں کو یاد کر کے ماتم نہ کرے، بلکہ جشن منائے۔

انور بھائی نے شہرت اسی عمر میں پائی جس میں شہرت ملنی چاہئے ورنہ حضرت خمار بارہ بکوی کی طرح امریکہ جا کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ، ”میں صحیح جگہ پر غلط عمر میں آیا ہوں“ دراصل زیادہ دیر سے ملی شہرت بڑھاپے میں ملی اولاد کی طرح ہوتی ہے، اپنی شہرت سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا ہو، لیکن ان کے کھیلتے اور مچلتے ہوئے شباب کو کافی سہولتیں میسر رہیں۔ گول چہرہ اترتی ہوئی شام جیسا رنگ، جسے، شیاں رنگ، بھی کہا جاتا ہے، ستواں ناک، نشیلی مگر سوچتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کی خواہشات پر پڑا ہوا کالے فریم کا ایک موٹا سا چشمے کا پردہ، کبھی سلک اور کبھی کھادی کا کرتا پا جامہ، کبھی

نہروکٹ کھادی کی واسکٹ، کبھی ڈگمارکٹ ریشمی گاؤن، کبھی کبھار ہاتھ کا ڈھیلا ڈھالا کتھی یا پھر مہندی کی پتیوں جیسے رنگ کا سویٹیر،

سویٹر بننا کیوں چھوڑا
جانم کو معلوم نہیں ہے
کتنوں نے فرمائش بھی کی
اون کے گولے دوڑ کے آتے
تیلی کانوں میں کچھ کہتی
تعریفوں کی رشوت پا کر
تھوڑی سی بھی چاہت پا کر
اکثر کوشش کرنے بیٹھی
لیکن جب بھی اون کے گولے
چھو لیتے ہیں تیلی کو
مجھ کو تمہارے سارے پھندے
رہ رہ کر یاد آنے لگتے

لیکن جذبات اور موسم سرد ہونے سے پہلے انور بھائی نے ادبی شمال اوڑھنا شروع کر دیا۔ انور بھائی کی شہرت کا چھوٹے سے قصبے جلال پور کی بین الاقوامی شہرت کا سبب بن گیا، اب تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ جلال پور کا نام آئے اور انور بھائی یاد نہ آئیں یا بھائی انور یاد آئیں، اور جلال پور کی یادوں کے چراغ نہ جھلملانے لگیں۔ جلال پور کے ایک ننھے سے شہر نے حفاظت اور ناز برداری کرنے والی مٹی سے سونے کا زیور بنا کر عزیز اردو سلمہا بنت ہندوستان کے گلے میں ڈال دیا۔ انور بھائی سے میری قربت ہوئی تو 100 ریکلو میٹر کا فاصلہ کم ہو کر ایک میز پر رکھے دو گلاس میں جتنا رہ گیا۔ انور بھائی بنت عنب کے شیدائی، میں اپنے زخموں کا لہو چاٹنے کا عادی، پھر بھی میرے فلسفے کے لحاظ سے جو چیز دوستوں کو اچھی لگ گئی، اسے میں نے اپنے اوپر حرام کر لیا، میز پر رکھے گلاس کا فاصلہ آج تک کم نہیں ہو سکا، دوستوں کو انگور کی بیٹی سے کیا دوستی کرنا میں تو ہمیشہ انگور کو دوست رکھتا ہوں اصول بھی آخر کوئی چیز ہے۔

انور بھائی عمر میں تقریباً پانچ، چھ برس مجھ سے بڑے تھے۔ لیکن بہت سلجھے ہوئے معاملہ فہم اور دور اندیش آدمی تھے، اس لئے ان کی دوستی سے مجھے ہمیشہ فائدہ پہونچا کہانی کو مختصر کرتے ہوئے یہ بتانا ضرور ی ہے کہ آج انور بھائی کے بچے جس کسی بھی مقام پر ہوں ان کے مستقبل کے لئے انور بھائی نے اپنی زندگی فضول خرچی کے ساتھ گزاری غالباً ۸۰ رکی دہائی میں ایک مشاعرہ باندہ میں تھا انور بھائی نے مجھے فون کیا اور مجھ سے پروگرام پوچھا میں نے انھیں بتایا کہ میں اس تاریخ کو اپنے گھر رائے بریلی میں رہوں گا، اور وہاں سے میں مشاعرے کے لئے نکلوں گا، میرے ساتھ استاد والی آسی بھائی بھی ہوں گے۔ انور بھائی نے ہنستے ہوئے کہا کہ یا راپنی کار میں ایک سیٹ میرے لئے بھی بک کر لو یوں بھی بہت دنوں سے انور چچا (میرے والد) سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔

غرض کہ ہم لوگ وہاں سے شام کو باندہ کے لئے نکلے اور تقریباً مشاعرے کے وقت باندہ پہنچ گئے، جسٹس قدوسی اسی مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے، مشاعرہ اپنی ترنگ میں پہاڑی جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا، سامعین چھپلے تالاب کی طرح اتھل پھتل ہو رہے تھے، ہر شاعر باندہ کے باذوق سامعین کی طرف سے داد و تحسین سے نوازا جا رہا تھا۔ یوں بھی باندہ کے سامعین کا کیا کہنا ایک طرف تو وہ بیڑ کا علاقہ بھی کہلاتا ہے، جہاں بڑے بڑے ڈاکو پیدا ہوئے، جس علاقے کے نواب یعنی باندہ کے نواب کو مرزا غالب کی میزبانی کا کئی بار موقع ملا، دریا بہاؤ پر تھا مرزا کی کشتی باندہ کے ساحل تک نہیں آ سکتی تھی، تو انھوں نے وہاں راتوں رات مرزا غالب کے ٹھہرنے کے لئے ایک سرائے بنوا دی تھی ایسے ادب نواز شہر کے لوگ عروس غزل کو نوازتے وقت نخل سے کیسے کام لے سکتے ہیں۔ مشاعرہ ختم ہوا والی بھائی جسٹس قدوسی کے ساتھ ان کی کار پر بیٹھ کر لکھنؤ چلے گئے۔ کیونکہ مجھے اپنے

کاروباری سلسلے میں باندہ سے الہ آباد جانا تھا، انور بھائی نے نظامت کی گھڑی باندھتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ یار تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا کہ انور بھائی مجھے تو الہ آباد جانا ہے۔ میں نے کہا کہ آئیے میرے ساتھ چلئے۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے وہ موت سے بہت ڈرتے تھے، ایک تو میں بھی رات بھر کا جاگا ہوا اور تقریباً ڈھائی سو کلو میٹر کی ڈرائیونگ اس میں گاڑی کبھی کبھی ریف بھی چلانی پڑ رہی تھی۔ انور بھائی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ارے، ارے اللہ رحم کرے آپ بڑی خطرناک ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ یوں بھی منور بھائی جب میں آپ کے ساتھ سفر کرتا ہوں تو یوں بھی میں اپنی آنکھ بند کر لیتا ہوں، میں نے اُن سے مسکراتے ہوئے کہا کہ انور بھائی گنہگار آدمی موت سے بہت ڈرتا ہے، وہ جھنجھلا کے کہتے کہ فلسفہ مت بگھاو آگے دیکھو، الہ آباد آگیا نیند مجھ مات دینے پر پوری طرح تیار تھی ظاہر ہے کہ انور بھائی کا بھی یہی حال ہوگا۔ لیکن بقول حضرت والی آسی۔

صرف بچوں کی محبت میں یہ رسوائی ہوئی
ورنہ ساحل پر بناتے ریت کا گھر اور ہم
میں نے انور بھائی سے کہا کہ چلئے ہوٹل میں
چل کر سوئیے اب آپ اس حالت میں نہیں کہ اب
مزید سفر کر سکیں، وہ کہیں کھو، سکے گئے، پھر کہنے لگے
نہیں، منور بھائی کالج میں ناغہ ہونے سے تنخواہ بھی کتنی
ہے اور رپورٹ بھی میلی ہوگی۔ آپ ایسا کیجئے کہ آپ
اپنے ڈرائیور سے کہیے کہ بس اڈے لے جا کر مجھے
جالپور کی بس پر بٹھا دے میرا جی نہیں مانا اور میں نے
انور بھائی سے کہا میں خود بس اڈے تک چلتا ہوں
راستے میں کھوئے کھوئے لہجے میں کہنے لگے کہ منور
بھائی اپنے چاروں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے شوق
میں زندگی کو اور ٹائم میں خرچ کر رہا ہوں۔ نہت علی
گڑھ میں ہے شہر یار، گڈو اور جاٹا رہی ہیں۔ ایک
انگریزی کے لکچرر کی جو تنخواہ پرائیوٹ اسکولوں میں

ہوتی ہے اتنے بڑے اخراجات کا بوجھ، اٹھانے کے
لئے نہیں ہوتی، ان دنوں مشاعروں میں بھی دو ڈھائی
ہزار کا ہیمنٹ ہوتا تھا، ظاہر ہے معمولی تنخواہ اور
مشاعرے کے معمولی پروں سے اپنے بچوں کو بہت
اونچا نہیں اڑایا جاسکتا۔

تقریباً بیس برس سے اسٹیج اور نجی زندگی میں
بھائی انور میرے دوست اور بڑے بھائی رہے۔ بلکہ
بڑے بھائی کا حق بھی ادا کیا، یعنی اس رشتے کو پوری
تہذیبی معنویت سے بھی سرفراز کیا۔ پچھلے چار پانچ
برسوں نے غالباً ہم دونوں کو بہت تھکا ڈالا، کچھ گھریلو
الجھنیں، کچھ روزگار زمانہ اور سب سے بڑھ کر مختلف
بیماریوں کے سانپوں نے ہم دونوں کو خوب ڈسا، ہم
دونوں تھک بھی گئے اور کچھ ٹوٹ بھی گئے۔ یہ ایسی
ٹوٹ پھوٹ تھی۔ جسے سائنس کی جدید ترین مشینیں بھی
محسوس نہیں کر سکتیں۔ مشاعروں میں گزری ہوئی
راتوں نے جسم کو تھکن دے کر آنکھوں سے نیندیں
چھین لیں، اور بھائی نے بھی شب بیداری کے کفارے
کے طور پر مشاعروں میں جانا کم کر دیا۔ انھوں نے کچھ
دنوں تک غم غلط کرنے کے لئے ٹی وی سیریل کے
اسکرین پلے اور ڈائلاگ لکھے، لیکن ماضی کی تھکن حال
کی چستی کو کھا جاتی ہے، اس شوق نے انھیں گھر سے پھر
دور کر دیا۔ جالپور کی صدائیں، مالی پور اسٹیشن کے
پلیٹ فارم کا انتظار بچوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور
بھابی صاحبہ کے الجھے ہوئے گیسو، سب کے سب انور
جالپوری کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کہاں کنارِ اودھ کی
شامیں اور جگنوؤں کی روشنی کہاں راجستھان کی جلتی
ہوئی ریت پر انگلیوں سے مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ تاریخ
لکھنا؟ انور بھائی جے پور کا راج گھرانا چھوڑ کر اپنی
کھیریلوں کے سائے میں لوٹ آئے۔

چاندنی میں رات بھر سارا جہاں اچھا لگا
دھوپ جب پھیلی تو اپنا ہی مکاں اچھا لگا
انور بھائی کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو ان

کی صاف گوئی ہے۔ ان کے بارے میں میرا ذاتی
تجربہ کچھ اس طرح ہے۔ مشاعرے سے پہلے کوئی نو
عمر مولوی، اور وہ بھی ایسے مولوی جن کو ہر مسلک کے
لوگ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مشاعرے
میں ابتدائی تقریر کے وقت لفظوں کا چپا چپا کر بولنے والا
ایسا ہوشیار لیڈر، جو الیکشن کے بعد عوام کو کچا چپا جانے کی
فکر میں رہتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی انور جالپوری
جہار کھنڈکتی مورچہ کے تھکے ہارے شیبوسرین جیسے۔

سفر میں بہت کم گفتگو کرتے اور کسی بوڑھے
فلاسفہ کی طرح آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتے ہوئے،
ٹرین کی پٹریاں بدلتے وقت ایک آدھ بار کسی دنیا سے
بیزار دوریش کی طرح آنکھیں کھول کر کھڑکی کے باہر
بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھنا، اور پھر یوں مطمئن
ہو جانا جیسے جہاز کا کپتان کنارہ دیکھ کر زیر لب مسکراتا
ہے۔ کھانے پینے میں کوئی خاص شوق نہیں، پاس میں
اچھی کتابیں ہوئیں تو پڑھ لی۔ آس پاس میں اچھا چہرہ
ہو تو دیکھ لیا۔ دیکھتے وقت آنکھوں میں وہی حسرت جو
جنت دیکھتے ہوئے گنہگار کے دل میں ہوتی ہے۔ جسے
ناپسند کرتے ہیں، اسے بھی دیکھ کر نہ مرجھاتے ہیں اور نہ
ہی منہ پھیر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے سے بڑی دوستی،
سگریٹ سے بے پناہ لگاؤ پان کا انتظار ہمیشہ محبوب کی
طرح کرتے ہیں۔ کوئی اچھا شعر سنا دے تو اٹھ کر بیٹھ
جاتے ہیں۔ پھر غزل کہنے کے لئے زمین مانگتے
ہیں۔ لیکن زمین کے لئے صرف ان لوگوں سے کہتے
ہیں جنہیں زمیندار سمجھتے ہیں۔ ایرے غیرے کی تو
سگریٹ بھی پینے میں سراپا کھنڈکی تکلف بن جاتے ہیں
۔ شعر کہنے اور عشق میں تاخیر کرنے والوں کو کسی حکیم سے
رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر اس
طرح اترتے ہیں جیسے گھر کے آگن میں چہل قدمی
کر رہے ہیں۔ نوجوانی میں ناظم مشاعرہ ہونے سے
صلاحیتوں پر داغ بٹ لگ جاتا ہے، جس طرح ہندوستانی
پارلیمنٹ میں اسپیکر کی صلاحیت سے کوئی انکار نہیں کرتا

لیکن کسی کے دل میں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ جو شخص پارلیمنٹ ہاؤس میں براہمان لگ بھگ پانچ سو بیالیس بھانت بھانت اور پرانت پرانت کے شیروں کو قابو میں رکھ سکتا ہو (جن میں اکثر آدم خود ہو چکے ہیں) وہ شخص ہندوستان کی کسی بھی وزارت یا وزارت عظمیٰ کے قلم دان کا بہتر محافظ ہو سکتا ہے۔ لیکن ارباب سیاست نے اسپیکر کو اور اقتدار ان ادب نے ناظم مشاعرہ کو رنگ ماسٹر سمجھ کر نظر انداز کر رکھا ہے۔

انور بھائی کی خداداد صلاحیت سلیقے اور ہنر نے نظامت جیسی غیر ضروری چیز کو بھی فن بنا دیا ہے، اور یہی وہ ہنر ہے، جسے حاصل کرنے والا شخص دلچسپ اور باوقار شخص بن جاتا ہے۔ مشاعروں میں باقاعدہ نظامت کرنے والوں میں انور بھائی اکیلے شخص ہیں، جو ہر شاعر کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔ کلاسیکی شاعری کے علاوہ عصری ادب کے اتار چڑھاؤ پر بھی ان کی نگاہ مرکوز رہتی ہے۔ ان کا مسلک کوئی بھی ہو لیکن وہ شعر کے معاملے میں دیوبندی یا صف بندی کے قائل نہیں ہیں۔ مشاعروں کو انھوں نے کبھی ٹونگی یا میوزیکل پارٹی نہیں بننے دیا۔ آخر آخر تک وہ مشاعرہ کے ادبی وقار کو بلند رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ وہ اکیلے ناظم مشاعرہ ہیں، جو اس بات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں کہ مشاعرے میں موجود غیر مسلموں میں اردو زبان و ادب کی رسوائی نہ ہونے پائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دیوبند شریف سے دہلی تک انور بھائی کی شخصیت کا ظلم برقرار رہا۔ نظامت سے ان کی دلچسپی کم ہونے سے مشاعرہ اپنے معیار سے بہت نیچے آتا جا رہا ہے، یا پھر مشاعروں کے گرتے معیار سے انھوں نے مشاعروں سے کترانا شروع کر دیا تھا۔ تنقید کے اجارہ داروں کے حساب سے انھوں نے شاعری بہت اچھی نہ کی ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان کی کمزور شاعری بھی ادبی رسائل میں اکثر چھپنے والی غزلوں سے بدرجہا بہتر ہے۔

لیکن جب یار لوگ غزل سے زیادہ ترنم کی اور شاعری سے زیادہ نظامت کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو

فکر بھی کام چلا دوسرے کار کا طرفدار بن جاتا ہے۔ اور یہی وہ وقت ہے، جب سچا ادب کو ٹھٹھے اترتے ہوئے آدمی کے پیروں کی تھکن بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے شراب کی دکان میں شہد رکھان شہد کی مکھیوں کی شب و روز کی محنت سے

مجتبیٰ مسکین



اپنی مزاحیہ تحریروں اور طنزیہ جملوں سے ذہن کے درپچوں کو اکر دینے میں طاق مجتبیٰ حسین کو ہندوستانی طنز و مزاح کا شہنشاہ بھی کہا جاتا ہے۔ اردو ہی کیا دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی ان جیسا مزاح نگار شاید کوئی دوسرا نہیں۔ ادارہ 'نیادور' مجتبیٰ حسین سے طویل انٹرویو کے ساتھ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی ادبی عظمت پر بھرپور مواد کے ساتھ ستمبر ۲۰۱۸ء میں آپ کے روبرو ہوگا۔

سراسر مذاق کرنا ہے۔ انور بھائی کو بھی ادب کے ٹھیکیداروں نے شراب کی دکان کھولنے کا لائسنس تو دے دیا، لیکن نیم کے شہد سے سماج اور جسم میں سیاست کے پھوڑے پھنسیوں کی اجازت نہیں دی۔ یقیناً یہی

سبب ہے کہ ہم آج ایک بیمار سماج اور سیاسی چھوٹ چھات کے درمیان زندہ ہیں۔ انور بھائی جیسے شریف اور بھولے بھالے لوگ ادب اور سیاست دونوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن کچھ تو انور بھائی کا پوربی شرمیلا پن اور کچھ اقتدار ان ادب کی بددیانتی دونوں نے مل کر ایک اچھے شاعر کو مشاعرے کا مداری بنا کر رکھ دیا۔

استاد بسم اللہ خاں کسی تقریب میں وقت گزاری کے لئے تاش کے پتے لے کر بیٹھ گئے اور دوستوں کو بادشاہ بیگم اور جوکر کے کرتب دکھانے لگے۔ تقریب میں شریک ایک مارواڑی سیٹھ بھی، بسم اللہ خاں کے پاس آکر بیٹھ گئے تھوڑی دیر تک وہ تاش کے پتوں کا کرتب دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے نہایت ملتجیانہ لہجے میں استاد بسم اللہ خاں سے اپنی صاحبزادی کی شادی میں تشریف لانے کے لئے گزارش کرنے لگے۔ استاد بسم اللہ خاں تصویر خلوص بن گئے اور سیٹھ صاحب سے یہ کہتے ہوئے تقریب میں حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا کہ ”آپ کی بیٹی میری بھی بیٹی ہے“ آپ بے فکر رہیں۔ میں شادی کی تقریب میں ضرور شرکت کروں گا۔ مقررہ تاریخ پر استاد بسم اللہ خاں سیٹھ صاحب کے گھر پر تشریف لے گئے۔ سیٹھ سراپا انتظار بنے کھڑے تھے، بڑھ کر استاد بسم اللہ خاں کو نمستے کیا، پھر ان کی شہنائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو آپ شہنائی بجا لیتے ہیں۔“ اس دلچسپ مگر افسوسناک واقعہ کو مد نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے تو اس ناقد شناس زمانے میں انور بھائی کی شاعری استاد بسم اللہ خاں کی وہ شہنائی ہے، جس کی گونج سنتے ہی گنگا کا مقدس پانی اپنی لہروں کے اشارے سے منہ اندھیرے ہندوؤں کو انسان کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو با وضو ہو جانے کے لئے آواز دینے لگتا ہے اور ان کی نظامت ان تاش کے پتوں کی طرح ہے جو ہمارے ارباب ادب کی اس سخن فنی کو نمایاں کر دیتے ہیں جسے حکمت کی زبان میں کوڑھ کہا جاتا ہے۔



آصفہ زمانی

4/83، وشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

رابطہ: 9621914069

حمد و نعت کا بھی ممتاز نام انور جلالپوری

میں بھی 'توشہ آخرت' سے صرف سورہ فاتحہ کی مثال دینا چاہوں گی۔ صرف اسی کی مثال سے قاری کو قرآنی تراجم کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

الحمد لله رب العالمین

(سب تعریفیں اللہ کے واسطے ہیں جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔)

اب انور جلالپوری کے شعر میں ملاحظہ فرمائیے:
وہی رب تو سارے جہانوں کا ہے
مکانوں کا ہے لا مکانوں کا ہے

الرحمن الرحیم۔ مالک یوم الدین

(بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ مالک ہے روز جزاء کا)

شعری ترجمہ انور جلالپوری

رحیم اور رحمن بھی اس کے نام
چلائے وہی سارے جگ کا نظام
قیامت کے دن کا بھی مالک وہی
اسی کے اشارے سے دنیا کبھی

ایاک نعبد و ایاک نستعین

(اے اللہ! ہم تیری اطاعت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔)

انور جلالپوری

تری ہی عبادت سے ہے واسطہ
مدد کے لئے ہے تجھ ہی سے دعا

اهدنا الصراط المستقیم

(دکھا ہم کو سیدھا راستہ)

مذہب کے تعلق سے ان کی نظر اور مطالعہ وسیع تھا جس کی مثال منظوم شکل میں ان کا کلام ہے۔

انور جلالپوری کی قابلیت کا اندازہ ان کے منظوم تراجم سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ منظوم ترجمہ آسان کام نہیں ہے۔ ترجمہ کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی اصل روح مجروح نہ ہو اور ترجمہ نفس مضمون ادا کر رہا ہو، کامیاب مترجم کہلانے کا وہی مستحق ہے۔ انور جلالپوری کی شخصیت میں یہ خداداد صلاحیت موجود تھی۔

این سعادت بزور بازو نیست

تا ببخشد خدای بخشنده

(یہ سعادت بزور بازو حاصل نہیں کی جاسکتی جب تک خدائے تعالیٰ کی طرف سے ودیعت نہ کی گئی ہو۔)

انور جلالپوری کے منظوم تراجم میں 'اردو شاعری میں گیتا' ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ 'اردو شاعری میں گیتا' بھی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ 'اردو شاعری میں رباعیات خیام' بھی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے اور 'توشہ آخرت' قرآن شریف کے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ میں انہوں نے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ 'توشہ آخرت' واقعی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ان کے لئے توشہ آخرت ثابت ہوا۔ اسے انہوں نے اپنے والدین کے نام معنون کر کے ایک باکردار، نیک اور لائق اولاد کا بھی فرض ادا کیا ہے۔

شاعر اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے انور جلالپوری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک عمدہ قلمکار بھی تھے۔ ان کی شعری و نثری تخلیقات میں دو درجن سے زائد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ نثری تصانیف میں 'روشنائی کے سفیر'، ادبی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں مولانا آزاد، ملک زادہ منظور احمد، بشیر بدر اور راحت اندوری جیسی شخصیت کا ذکر شامل ہے۔ ان کا دوسرا نثری مجموعہ 'اپنی دھرتی اپنے لوگ' ہے جس میں ان کے وطن جلالپور کی اہم شخصیات کا تذکرہ ہی قابل مطالعہ ہے۔ انور جلالپوری نے قلم کے سفیر کے نام سے اپنی تیسری نثری کتاب ترتیب دی جس میں ہم عصر مشاہیر حضرات کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کی چوتھی نثری کتاب بھی مضامین کا مجموعہ ہے لیکن یہ کتاب اس لئے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں غیر معروف شعراء پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ انور جلالپوری کی چوتھی نثری کتاب ہے 'سفیران ادب' اس کتاب میں شعری، ادبی و ثقافتی مضمون شامل ہیں۔

جہاں تک انور جلالپوری کی شعری تخلیقات کا تعلق ہے مجموعہ غزلیات میں 'کھارے پانی کا سلسلہ'، 'خوشبو کی تہہ داری'، 'ادب کے اکشر' اور 'پیار کی سوغات' قابل ذکر ہیں۔ نعتیہ کلام کے مجموعات بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں ضرب لا الہ، بعد از خدا، حرف ابجد، جمال محمد (منظوم سیرت پاک) اور 'راہرو سے رہنما' تک ہے جس میں سیرت خلفائے راشدین کا منظوم ذکر ہے جو انہیں نعت گوئی میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

انور جلالپوری

بس اب نیک انسان بنا دے ہمیں
جو ہے سیدھا رستہ دکھا دے ہمیں

صراط الذین انعمت علیہم

(اور ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا انعام فرمایا)

انور جلالپوری

وہ رستہ جو انعام والوں کا ہے
ترے سچے پیغام والوں کا ہے

غیر المغضوب علیہم ولا الضالین

(اور ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تو نے

غضب نازل کیا اور وہ گمراہ ہوئے۔)

انور جلالپوری

ہمیشہ سے ہیں جو ذلیل اور خوار
بچالے ہمیں ان سے پروردگار

انور جلالپوری نے میرے دوسرے شعری

مجموعہ 'احساس بیکراں' پر بہت پر مغز تبصرہ لکھا تھا جو

میرے مجموعہ میں مع ان کی تصویر کے شامل ہے۔ اس

کی ابتدائی سطریں میں یہاں تحریر کر رہی ہوں۔ اسی
سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے اشعار کی
اصل روح کو پکڑ لیا تھا۔ ملاحظہ ہواں کا تبصرہ:

'مجھے نہیں معلوم کہ غموں کی کتنی شکلیں ہوتی

ہیں اور محرمیاں کس کس انداز میں پر چھائیں کی طرح

غمزہ لوگوں کا پیچھا کرتی رہتی ہیں مگر اردو کی بہترین اور

لا جواب قلم کار ڈاکٹر آصفہ زمانی سے مل کر اور ان کے

چہرے کو غور سے پڑھ کر اور آج بھی ان کی آواز کی

پرسوز تھر تھراہٹ کو محسوس کر کے مندرجہ بالا سبھی باتوں

پر یقین ہو جاتا ہے۔ جس خاتون نے اپنے باوقار اور

خوش مزاج شوہر (سید اعجاز رضوی، ایم۔ ایل۔ سی۔

منتری اتر پردیش) کے بے جان جسم کو خواب گاہ سے قبر

تک جاتے ہوئے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا ہو

اور جس ماں نے اپنی انتہائی لائق و فائق اور ہمہ جہت

شخصیت رکھنے والی اور راج نیتی میں بلند مقام تک

پہنچنے والی بیٹی (پروفیسر شیمہ رضوی، منتری اتر پردیش،

صدر شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) کو پی جی آئی کے

آئی سی یو میں کوما کی حالت میں دیکھا ہو اور اس کے
جنازے کو ڈبڈبائی اور پتھرائی آنکھوں سے ہمیشہ کے
لئے رخصت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ اس ماں کے
غم کی انتہا کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ان غموں نے ان
کی شاعری کو غم کے آنسوؤں کو ڈبویا، جب گھر ہی اجڑ
گیا ہو تو غزل مرثیہ بن جاتی ہے۔

(احساس بیکراں، ۲۰۱۶ء)

انور جلالپوری ہم سے اس قدر جلد رخصت ہو
جائیں گے، کسی کے تصور میں بھی نہ تھا۔ آج جب میں
ان کا یہ تبصرہ کوڈ کر رہی ہوں تو مجھے ان کی غزلیں بھی
مرثیہ کے ہم مرتبہ نظر آرہی ہیں کیونکہ ان میں زمانے کا
درد و سوز ہے۔ احساس کی گہرائی ہے۔ فکر کی بلندی ہے
اور ان کی اپنی بلند فکر ہے جو بلاشبہ انہیں دیگر ہم عصر
شعراء سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ بقول رئیس انصاری:

ہیں لکھنؤ میں آج بھی شاعر بہت رئیس

لیکن ہماری طرح کوئی سوچتا نہیں

□□□

’نیا دور‘ اگست ۲۰۱۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر نعمان قیصر، فارسی ادب میں غیر مسلم شعراء کی

خدمات پر ڈاکٹر سعدیہ جعفری، اردو شعروادب کے فروغ میں غیر مسلم شعراء پر ڈاکٹر اسرار الحق

اور اردو کے غیر مسلم شعراء کی شاعری میں اسلامی اثرات پر رضیہ پروین کے مضامین۔

ساتھ میں کملیشور کی ادبی خدمات پر مشرف عالم ذوقی، بلونت سنگھ کے فن پر رضوان انصاری،

تصوف اور ہندوستانی روحانیت پر ڈاکٹر نریش، جلیاں والاں باغ پر پی پی شریواستورند کے مضامین

رتن سنگھ، چندر بھان خیال، جینت پرمار، گلشن بریلوی، آشا پر بھات، دیپک بدکی، راجیو پرکاش ساحرو شال کھلر،

خوشبیر سنگھ شاد، پونم کوثر، رینو بھل، منیش شکلا، ٹینی و بھانازی، سیاسچد یو، رام پرکاش بخود، اویناش امن،

ریش پانڈے شکھر، دیپک نشاط، دیپک دانش، اوم پرکاش ندیم، سنجے مصر اشوق وغیرہ کی تخلیقات



سلی حجاب

3/32، ویل کنڈ، گوشتی ٹر، بکھنو

موبائل: 9453077420

بعد از خدا، گوہر آبدار

میں ان کی تمام شعری تخلیقات کا تذکرہ یا جائزہ لینا دشوار بلکہ ان کے ساتھ نا انصافی بھی ہوتی لہذا اپنے مذکورہ بالا بیان و تاثرات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ان کے نعتیہ مجموعہ 'بعد از خدا' کا انتخاب کیا۔ نعت گوئی ایک مذہبی فریضہ ہے اور ایک مسلمان کے لئے باعث ثواب و سعادت بھی ہے۔ دور حاضر میں شاعرانہ بے راہ روی اہل سخن کا وطیرہ بنی ہوئی ہے۔ انور جلالپوری کے ہدایت یافتہ پاکباز قلم نے اپنی عمر کے کئی سال نعت نبی اور مدحت رسول کے لئے وقف کر دیے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔ ان کی یہ تخلیق صحیح معنوں میں روشن ہے۔ اپنے اس نعتیہ کلام میں انور جلالپوری نے اسلامی فلسفہ اور پیغمبر اسلام کے فخر انسانیت و وجود کو محدود شرعی فکر میں اسیر نہ کر کے ایک آفاقی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی اور رسول مقبولؐ کو دین انسانیت اور دین کائنات کے رہبر اعظم کی حیثیت سے متعارف کروایا جو کہ غیر مسلم قاری کے لئے ایک پُر اثر اور اہم دستاویز بھی ہے اور دین اسلام کے فلسفہ کی آفاقیت کو عام فہم بنانے کا ذریعہ بھی۔

زیر تبصرہ تخلیق 'بعد از خدا' کو کتاب کہنا بے ادبی ہوگی۔ اسے صرف نعتیہ مجموعہ بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ تو عشق نبی میں پروان چڑھی ہے۔ حقیقتاً انور جلالپوری کے اس شعری کارنامہ کو عبادت کا درجہ حاصل ہے کہ وہ بحر عشق رسولؐ میں ڈوب ڈوب کر ابھرے ہیں اور ہر باران کو ایک گوہر آبدار حاصل ہوا مگر اس سرشاری میں بھی وہ گم کردہ حقیقت نہیں ہے۔ بلاشبہ بیانوں سے بند کی

بھی کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں یہ کارنامے نئے نہیں، اس سے پہلے بھی گیتا اور قرآن، گیتا نجلی کے ترجمے کئے جا چکے ہیں لیکن یہاں میرا موضوع ان تخلیقات کے اول و دوم ہونے پر بحث نہیں بلکہ ان کے تخلیقی شعور کی اس آفاقیت پر مرکوز ہے جو کسی شاعر کو مذہب انسانیت کا پیروکار اور مبلغ بنادیتا ہے۔

انور جلالپوری نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مذہبوں کا تقابلی مطالعہ وہ شروع سے کرتے رہے۔ ہندوستان کے اہم مذاہب کا عمیق مطالعہ اور ان کا تقابلی جائزہ لے کر بقول کبیر داس 'سار سب گہر لیا' کے مصداق صداقتوں کو خود میں جذب کر کے حقائق کا انکشاف کیا۔ حاصل شدہ علم، عرفان و آگہی کو شعری پیکروں میں ڈھال کر اپنی تخلیقات کی انفرادیت پر مہر لگا دی۔ اپنے قول و فعل میں وہ ہندوستان کی اس دیرینہ مذہبی رواداری کے پابند رہے جو ہندوستانی تہذیب کی میراث ہے۔ یہی وصف ان کی زبان میں بھی ہے یعنی انہوں نے اپنے جذبہ صادق کے اظہار کے لئے جس زبان کا استعمال کیا وہ عام فہم اور پُر اثر ہے۔ انہوں نے اپنی علیست اور زباں دانی کا بوجھ قاری کے ذہن پر نہیں ڈالا بلکہ علم اور مذہبی فلسفہ کو اتنی آسان اور رواں زبان میں پیش کر دیا ہے کہ قاری کو لطف بھی آئے اور مفہوم تک اس کی رسائی بھی ہو سکے۔

یہ ایک مجموعی تاثر تھا جو میں نے ان تمام تخلیقات کے حوالے سے مختصراً پیش کر دیا۔ ایک مضمون

اس حقیقت کا اعتراف تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے انور جلالپوری صاحب کو ہم سے چھین لیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا جسمانی وجود تو فنا ہو گیا لیکن ان کے روحانی وجود کا عکس، فکر و شعور حرف و صدا کے آئینہ خانے میں درخشاں اور تابندہ ہے۔ ان کی آواز فضاؤں میں گونجتی رہتی ہے۔ ان کے اشعار لبوں پر رقص کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تمام ادبی کاوشیں، شعری و نثری تخلیقات ان کے موجود ہونے کے دعوے پیش کرتی رہتی ہیں۔

انور جلالپوری کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ وہ بیک وقت ایک ادیب و شاعر، ایک مقرر و خطیب، ایک منفرد ناظم مشاعرہ، ایک ماہر تعلیم اور ایک قابل معلم تھے۔ ان سب خصوصیات سے ارفع و اعلیٰ وہ ایک مکمل انسان تھے۔ خلوص و محبت کے پیکر، اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مظہر، صاحب وسعت فکر و نظر کی اسی وسعت نے ان کے قلم، ان کی تحریر اور ان کی تمام نگارشات کا احاطہ کر رکھا تھا۔ ان کا قلم اسیر مذہب و ملت نہیں بلکہ اس آفاقی مذہب کا پیروکار و مبلغ تھا جسے دین انسانیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ انور جلالپوری کی باریک بین نظریں کائنات کے بنیادی اصولوں پر تھی یعنی وہ کثرت میں وحدت کی رمز آشتائیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر انہوں نے 'بعد از خدا'، راہرو سے رہنما تک کی تخلیق کی تو انہوں نے بھگود گیتا کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ ربیندر ناتھ ٹیگور کی مشہور زمانہ 'گیتا نجلی' کو بھی اردو کے پیکر میں ڈھال دیا۔ قرآن کے تیسویں پارے کا ترجمہ

یہ نظم عرفان خداوندی اور فیضان عشق رسولؐ ہے۔

اس طویل نظم، جسے شاعر نے 'جمال محمدؐ' کا عنوان دیا ہے، کو پڑھنے کے بعد اس کی چند اہم خصوصیات اور نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ الہامی آمد

۲۔ تاریخی تسلسل

۳۔ وجدان عشق رسولؐ

۴۔ کاشفانہ انداز بیان

اس نظم کے اشعار میں اول تا آخر اور دیکھ جھلک نہیں ملتی۔ محسوس ہوتا ہے کہ جذبہ صادق خود بخود شعروں میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ ذکر خدا ہو یا مدحت رسولؐ، عظمت الہی کا بیان ہو یا شان رسالت، لفظ گن کے اسرار ہوں یا رمز تخلیق آدمؑ کسی بھی مقام پر ان کا قلم رکتا نہیں۔ قبل گن کی خلائے بیکراں ہو یا فیکون کی تخلیق دو جہاں، تخلیق آدمؑ اور تخلیق زمین و آسمان۔ یہ تمام واقعات ارض و سماء تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ وہ بھی اتنی صداقت و حلاوت کے ساتھ جیسے کوئی عالم، ایمان مفصل کی تفصیلات و ترجیحات بیان کر رہا ہو یا ایمان مجمل کے اسرار کھول رہا ہو۔ حیات طیبہ کے تمام روشن پہلوؤں کا بیان کرتے وقت بھی تسلسل کہیں نہیں ٹوٹا۔ نور اول سے نور آخر تک پیدائش ہے۔ یتیمی تک، بچپن سے نوجوانی تک، غار حرا سے غار ثور تک، بشریت سے رسالت تک، حیات طیبہ کی ایک مکمل تصویر قاری کے ذہن میں ابھر آتی ہے۔ نظم کا ہر بند الگ الگ پہلو کو اجاگر کرتا ہے لیکن ربط و تسلسل مجروح نہیں ہونے پاتا۔

یہ طویل نظم بہ عنوان جمال محمدؐ اور اس سے قبل مجموعہ میں شامل نعتیں اور سلام اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ انور جالپوری سرشار عشق رسولؐ ہیں۔ وہ رسول جو محسن انسانیت ہیں۔ عشق نبیؐ کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہے، اس میں انوار الہی کی تابناکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم وحدانیت اور رسالت کے درمیانی پل

صراط کو آسانی سے پار کر لیتا ہے۔ یہ کسی نعت گو شاعر کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ جہاں تک اس نعت کے اسلوب اور انداز بیاں کا تعلق ہے وہ بھی اسی وجدانی کیفیات سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ سلاست و فصاحت کا ایک دریا قاری کو اپنے ساتھ رواں رکھتا ہے۔ پاکیزہ لفظیات، ترکیبات و تشبیہات سے نظم کا حرف حرف منور ہے۔ نظم میں غزلوں کی غنائیت اور موسیقیت ہے کیونکہ شاعر نے ردیف اور قافیہ برتنے میں احتیاط سے کام لیا ہے یا یوں کہئے کہ ہم وزن



ردیف اور قافیہ خود بخود زیر قلم آگئے اور اشعار کو ایک صوتی آہنگ عطا کر گئے۔ الفاظ گینوں کی طرح جڑے ہوئے لگتے ہیں۔ عربی اصطلاحات سے نظم میں جان آگئی ہے جو انہوں نے سرکارِ دو عالم کی تعظیم و تکریم کے لئے استعمال کئے ہیں مثلاً 'اعتبار قل ہو اللہ احد'، 'مشعل غار حرا'، 'اے صفات فقرہ بلغ العلیٰ کشف الدجی وغیرہ وغیرہ۔

یوں تو نظم کی ہر لائن اپنی جگہ اہم ہے اور اہم تاریخی حقائق کی مظہر ہے لیکن مسدس کے آخری دو

مصرعے خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں مثال کے طور پر: دیر کی صورت تھا کعبہ کر دیا تو نے حرم سنتی تھیں حوا اے آدم جسے کہتے رہے یا پھر

روح کو اندر سے خواہش تھی کسی الہام کی دراصل آخری دو مصرعوں میں ہمیں اسلامی فلسفہ و فکر کی نہ صرف جھلک بلکہ ترجیحات اور تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ تخلیق آدمؑ کی عظمت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

عرش اعظم اس طرح آدمؑ کا پہلا گھر ہوا جلوہٴ معبود اس کی آنکھ کا منظر ہوا زمین پر انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ نے وقتاً فوقتاً جو پیغمبر مبعوث فرمائے اور جو صحیفے نازل کئے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ عالم انسانیت کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس تفصیل کا بیان دو مصرعوں میں ملاحظہ ہو:

امتوں نے ان سے پایا ایک دستور حیات ان پہ جو اتریں کتابیں وہ ہیں منشور حیات تاریخ عالم میں ہجرت مدینہ کا واقعہ ایک انتہائی اہم موڑ اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی بنیاد فراہم کرتا ہے جسے انور جالپوری نے بڑی مہارت سے ذیل کے دو مصرعوں میں بیان کر دیا۔

ہاں اسی ہجرت نے کھولا انقلاب نو کا باب مستقل ایثار سے اک قوم پیدا ہو گئی انور جالپوری نے دراصل جہد مسلسل، محنت و مشقت، ایثار و صبر ایمان و ایقان کی علمبردار اس قوم کی تاریخ رقم کر دی جو رہبر عالم بنی اور اس اسلامی مذہب و فلسفہ کی حقیقت بیان کر دی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دین اسلام صرف دین مسلم نہیں بلکہ دین انسانیت ہے جس کے اصول آفاقی حیثیت کے حامل ہیں۔

□□□



خوشبیر سنگھ شاد

B-9، سلور ریزیدنسی اپارٹمنٹ، نزد ڈال

چوک، جالندھر، موبائل: 9872011882

اب تو بس آواز ہی آواز ہے....

شاد کی خدمت عالی میں ایک تحفہ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ انور بھائی! یہ میں اپنی بیوی کو دکھاؤں گا کہ اب تو یقین ہوا کہ میں شریف انسان ہوں۔ کچھ دیر میں ٹی وی اینکر ونود دعا بھی آگئے اور میں نے انہیں انور بھائی سے ملوایا۔ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر انہیں دکھائی اور کہا کہ یہ میری برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے بھگوت گیتا کا اردو شاعری میں منظوم ترجمہ۔ میرے پاس ایک ہی کاپی تھی اور میں نے خوشبیر کو دے دی۔ آپ اپنا کارڈ دے دیجئے میں آپ کو جاتے ہی بھیج دوں گا۔ اردو شاعری میں گیتا کے لئے انہیں اتر پردیش سرکار کایش بھارتی سمان ملا اور ان کی وفات کے بعد بھارت سرکار نے انہیں پدم شری کے خطاب سے نوازا۔ کاش! یہ ان کی زندگی ہی میں ہو جاتا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے بعد انور جالپوری نے جس خوبصورت انداز میں اس ذمہ داری کو سنبھالا اس نے کسی حد تک منظور صاحب کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ اب اس کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کیسے بھرے گا، اس کا جواب تو صرف اور صرف وقت کے پاس ہے۔ زندگی لڑکھڑانے کے بعد بھی چلتی رہتی ہے۔ شاعرے بدستور ہور ہے ہیں۔ کچھ نئے لوگ اچھی نظامت بھی کر رہے ہیں لیکن انور بھائی کی اس جادوئی اور مٹلی آواز کا بدل شاید کبھی نہ مل پائے۔

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھوڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

□□□

میں نے گرین روم میں انہیں یہ قصہ سنایا تو ہنستے ہوئے بولے، 'یار خوشبیر! معاف کرنا۔ اس وقت تمہیں پہچان نہیں سکا۔'

۱۶ دسمبر ۲۰۱۷ء کو شکر شاد مشاعرے میں شرکت کی۔ مشاعرے سے پہلے DCM گروپ کے مالک مادھو صاحب کے گھر شاعروں اور کچھ دوسرے مہمانوں کے لئے پذیرائی کا اہتمام تھا۔ وہاں پہنچا تو دوسرے شاعروں کے ساتھ انور بھائی بھی موجود تھے۔ کچھ دن پہلے ہی لندن میں ان کی جوان بیٹی کی موت ہو گئی تھی۔ میں نے انور بھائی کی ایسی تصویر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ محفل کے آداب نبھاتی ہوئی ہونٹوں پر ایک رسمی مسکراہٹ لیکن آنکھوں میں کائی کی صورت جمی ہوئی ایک گہری اور دبیز اداسی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور دہلی ہوئی آواز میں اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ ان کی آنکھوں کے کنارے پر نمی سی ابھر آئی اور اس نمی نے میری روح کو اندر تک نم کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ جس بیٹی کو پھولوں کی طرح اپنی بانہوں کے جھولے میں جھلایا ہوا ہے ایک باپ نے کیسے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے، خوشبیر! تم کوئی جھوٹا یا بیگ لائے ہو؟ میں نے حیرانی سے پوچھا، کیوں انور بھائی؟ بولے، تمہیں اپنی کتاب دینی ہے۔ پھر انہوں نے اپنی نئی کتاب 'اردو شاعری میں گیتا' نکالی اور اس پر لکھا تھا: 'میرے پسندیدہ شاعر، شریف انسان اور گنگا جمنی تہذیب کے پیارے نمائندے جناب خوشبیر سنگھ

یہ ہم بے حسی کے کس دور سے گزر رہے ہیں کہ کوئی بری سے بری خبر بھی ہمیں کچھ لمحوں سے زیادہ متاثر نہیں رکھتی ہے اور ہم جلد از جلد اپنے معمول پر لوٹ آتے ہیں۔ احساس کا گرداب کہیں ہمیں بہت گہرائی تک نہ لے جائے اسی ڈر سے ساحل پر بیٹھے بیٹھے ہی ڈوبنے والوں کی موت کا سوگ منالیتے ہیں۔ یہ آج کے اس تنگ دور کی تلخ سچائی ہے۔ ۸۰ کی دہائی کی شروعات تھی شاید شاعری کے کیڑے نے ابھی کاٹا ہی تھا۔ اپنے ہم عصر نوجوانوں کی طرح ساحر کے جادو نے مجھے بھی اپنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ رویندر الیہ کے ایک مشاعرے میں انور جالپوری کو پہلی بار سنا۔ غزل تو یاد نہیں لیکن ایک شعر کا ایک مصرعہ آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔

'کھٹا کھٹا، میٹھا میٹھا یعنی تیرے نام کا پیڑ'

مشاعرے کے بعد انہوں نے جناب والی آسی سے پوچھا کہ والی بھائی آپ کو یہ شعر کیسا لگا؟ اس سے پہلے کہ والی صاحب کوئی جواب دیتے۔ میں بول پڑا، 'انور صاحب! بہت اچھا شعر ہے۔' مونے سے چشمے کے پیچھے سے کا جل لگی ان بڑی بڑی آنکھوں نے جس انداز سے میری طرف دیکھا، میں گھبرا گیا۔ ان میں حیرت سے زیادہ حقارت تھی۔ شاید انہیں کسی سکھ نوجوان سے یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ وہ شعر سمجھ کر داد بھی دے سکتا ہے۔ وہ تو والی آسی جیسے معتبر شاعر کے منہ سے اس شعر کی تعریف سننا چاہتے تھے۔ گزشتہ سال لکھنؤ ایکسپریشن سوسائٹی کے مشاعرے سے پہلے



شفیع ایوب

ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی : موبائل : 9810027532

انور جلالپوری ایک طرحدار شخصیت

ناگری میں ”جاگتی آنکھیں“ کے نام سے ان کی غزلوں کا مجموعہ منظر عام پہ آیا اور پسند کیا گیا۔ انھوں نے گرو دیو را بندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق کتاب گیتا نچلی کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ ’اردو شاعری میں گیتا نچلی‘ نام سے یہ کتاب شائع ہوئی تو عالمی سطح پر اس کی پذیرائی ہوئی۔ اور پھر بھگوت گیتا کے مفہوم کا منظوم اردو ترجمہ کر کے انور جلال پوری نے نہ صرف اپنی قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا بلکہ اپنے چاہنے والوں کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کی۔ ادئے پر تاپ سنگھ، ڈاکٹر گوپال داس نیرج اور مراری باپو جیسی عظیم شخصیات نے انور جلال پوری کے فن کو تسلیم کیا اور انھیں اپنا آئینہ وار دیا۔ جہاں تک انور جلال پوری کی نثر نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنی نثر سے بھی اہل علم کو متاثر کیا۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔ اردو میں ’روشنائی کے سفیر‘ اور دیوناگری میں ’اپنی دھرتی اپنے لوگ‘ مضامین کا مجموعہ ہے۔ انور جلال پوری کی نثر میں جادو ہے۔ یہ نثر راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کی نثر جیسی کھردری بھی نہیں ہے اور کرشن چندر کے افسانوں کی نثر جیسی رنگین بھی نہیں۔ ہاں اس نثر میں انور جلال پوری کے خلوص کی چاشنی اور ادھی کی مٹھاس ضرور ہے۔ مشہور صحافی اور ہندوستان میں وائس آف امریکا کے نمائندہ سمیل انجم ان کی نثر نگاری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”اگر کوئی مجھ سے پہلے پوچھتا کہ انور جلال

پوری ایک اچھے شاعر اور ناظم مشاعرہ تھے یا ایک

انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے۔ اودھ کے علاقے میں ضلع امبیدکر نگر میں جلال پوری ایک تاریخی قصبہ ہے۔ اسی تاریخی قصبے میں ۶ جولائی ۱۹۳۷ء کو حافظ محمد ہارون کے گھر ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام والدین نے انوار احمد رکھا۔ یہی انوار احمد انور جلال پوری بن کر دنیا بھر میں علم کی روشنی پھیلاتا رہا۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد گورکھپور یونیورسٹی سے گریجویشن اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ وہ جلال پور کے این ڈی کالج میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں انھوں نے اودھ یونیورسٹی سے اردو میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے نہ صرف انگریزی ادب کا مطالعہ کیا بلکہ اردو اور ہندی ادب کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ انھیں تینوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ انور جلال پوری ایک خوش فکر شاعر تھے۔ انھوں نے صرف مشاعروں کی ضرورت کے لئے شاعری نہیں کی بلکہ جو دل پہ گزرتی تھی اسے رقم کرتے رہے۔ ان کی بیشتر شاعری مٹی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کے باب میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ’ضرب الاالہ‘ ’بعد از خدا‘ اور ’حرف ابجد‘ ان کے نعتیہ مجموعے ہیں۔ ’جمال محمد‘ کے نام سے سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منظوم کیا۔ ’راہرو سے راہنما تک‘ سیرت خلفائے راشدین بھی ان کا ایک انمول تحفہ ہے۔ انھوں نے پارہ عم کا منظوم ترجمہ ’توشہ آخرت‘ کے نام سے کیا ہے۔ ’کھارے پانیوں کا سلسلہ‘ خوشبو کی رشتہ داری اور دیو

کسی مضبوط، مستحکم اور بلند عمارت کے لئے چار ستون بچھاؤں کا تصور کئے جاتے ہیں۔ ہندستان میں مشاعروں کی نظامت کو اگر ایک خوبصورت عمارت تصور کر لیں تو اس کے چار ستونوں کے نام ہیں۔ ثقلین حیدر، عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری۔ ہندستان کے طول و عرض میں بے شمار مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ہر مشاعرے میں ایک ناظم ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کوئی نواآموز تو کبھی کوئی کہنہ مشق شاعر نظامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ لیکن جن حضرات نے نظامت کو باقاعدہ ایک فن کا درجہ عطا کر دیا ہوا ان میں سر فہرست یہی چار حضرات ہیں جن کا ذکر سطور بالا میں ہوا ہے۔ سب سے پہلے محترم ثقلین حیدر اس دنیا سے رخصت ہوئے پھر دیار فراق و مجنوں گورکھپور کی علمی و ادبی فضا کو سو گوار چھوڑ کر عمر قریشی راہی ملک عدم ہوئے۔ دو برس پہلے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھی داغ مفارقت دے گئے۔ اور اب سال ۲۰۱۸ء کا بھی آغاز ہی ہوا تھا، احباب ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد پیش کر رہے تھے کہ شہر آرزو لکھنؤ سے ۲ جنوری ۲۰۱۸ء کو یہ جانکاہ خبر آئی کہ انور جلال پوری بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔

انور جلال پوری کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ لیکن مشاعروں میں ان کی نظامت نے ایسی چمک پیدا کی کہ باقی صلاحیتیں اور کارگزاریاں دھندلی نظر آنے لگیں۔ فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد اور شمس الرحمن فاروقی کی طرح انور جلال پوری بھی اردو کے نہیں بلکہ

اچھے نثر نگار تو میں فوراً جواب دیتا کہ وہ تو شاعر اور ناظم تھے ان کا نثر سے کیا تعلق؟ لیکن جب میں نے ان کے مضامین کے مجموعے ”روشنائی کے سفیر“ کا مطالعہ کیا تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ ایک اچھے شاعر اور ناظم مشاعرہ تھے یا ایک بہترین نثر نگار۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ جتنے اچھے شاعر و ناظم تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔“

(سہیل انجم، انور جلال پوری اپنی نثر کے آئینے میں، اردو اسٹار نیوز ٹو ڈے)

انور جلال پوری نے بہت کم عمری میں شاعری شروع کر دی تھی۔ ان کے ہم عصر شاعر و ادیب ان کی پُرگوئی کے قائل تھے۔ زبان پہ انھیں بھرپور دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک بہترین خطیب تھے۔ کسی بھی موضوع پہ گھنٹوں تقریر کر سکتے تھے۔ ان کی خطابت میں پہاڑی ندی کی روانی تھی۔ اپنی فلسفیانہ گفتگو میں اودھ کی شیرینی ملا کر پیش کرتے تو سامعین پر جادو کر دیتے تھے۔ عام طور پر مشاعروں کے شاعر مطالعہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ انھیں مطالعہ کی فرصت بھی نہیں ملتی کہ پانی پیٹ ملکوں ملکوں شہروں شہروں انھیں پھراتا رہتا ہے۔ کچھ اس قدر زگیسیت کے شکار ہو جاتے ہیں کہ انھیں میر وغالب سب حقیر نظر آتے ہیں۔ لیکن انور جلال پوری حقیقت پسند تھے۔ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی قدم زمین پر رکھتے تھے۔ وہ سراپا عاجزی و انکساری تھے۔ مطالعہ کے شوقین تھے۔ تمام مصروفیات کے باوجود پڑھنے کے لئے وقت نکالتے تھے۔ اور صرف اردو ادب نہیں پڑھتے بلکہ ہندی اور انگریزی ادب کا بھی مطالعہ خاصہ وسیع تھا۔ ٹیکور کی گیتا نجلی کو پڑھنا، سمجھنا، اپنی فکر کا حصہ بنانا اور پھر منظوم ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اس کام کو انور جلال پوری نے نہایت مہارت سے انجام دیا۔ ایک طرف انھوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا تو دوسری

جانب قدیم ہندوستانی تہذیب پہ بھی ان کی گہری نظر تھی۔ جس ڈھائی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ کو قرۃ العین حیدر نے شہرہ آفاق ناول ”آگ کا دریا“ میں سیٹنے کی کوشش کی تھی، اس تاریخ پہ انور جلال پوری بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ جنگ بدر، صلح حدیبیہ اور سانحہ کربلا پر نظر رکھنے والے انور جلال پوری مہابھارت کی جنگ پہ بھی نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ نہ صرف گیتا کے مفہوم کو سمجھ سکتے تھے بلکہ گیتا کے اُپدیش کی گہرائی اور معنویت سے پوری طرح واقف تھے۔ انھیں زمانہ طالب علمی سے گیتا میں دلچسپی تھی۔ انھوں نے گیتا کے حوالے سے اپنی پی ایچ ڈی کا خاکہ بھی تیار کیا تھا جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ایک بار پھر گیتا کی تعلیمات کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ انور جلال پوری نے شری مد بھگوت گیتا کے سات سو ایک شلوکوں کو کس فنی مہارت کے ساتھ ۱۷۶۱ اشعار کے قالب میں ڈھال کر اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

لیکن اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ انور جلال پوری کی عالمی شہرت ان کی بے مثال نظامت کی مرہون منت ہے۔ عہد میر یا عہد غالب میں مشاعروں کا جو بھی رنگ رہا ہو لیکن ہندوستان میں حصول آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد جب عاشقانِ اردو نے ذرا سنبھالا لیا تو مشاعروں نے زبردست عوامی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کی آزادی کے ساتھ تقسیم وطن کا سانحہ بھی پیش آیا۔ اردو اور اہل اردو پر بھی بڑی ضرب پڑی۔ ان حالات میں اردو والوں کی نفسیات کا اندازہ کرنا آج کی نسل کے لئے آسان نہیں ہے۔ اس پُر آشوب دور میں سرحد پار سے آئے ہوئے لوگ اردو کے لئے ماحول سازگار بنانے میں پیش پیش تھے۔ ان میں جگن ناتھ آزاد، گوپال متل، دیوندر اسر، بلراج کوئل، کلدیپ نیر اور ان جیسے بے شمار اردو والے

تھے۔ پھر ہرمحاذ پر اردو کے لئے ماحول سازگار کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ان کوششوں میں عوامی مشاعروں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم اردو کو میسر آیا جو دنیا کی کسی اور زبان کے پاس نہیں تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں عوامی مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، خندوم جی الدین، ساحر لدھیانوی، فراق گورکھپوری جیسے بڑے شاعر مشاعروں کے پلیٹ فارم سے عوام میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرنے لگے۔ نوح ناروی، انور صابری، بخش جبار چوی، تاجور نجیب آبادی، نشور واحدی، فنا نظامی اور مشیر جھنجھانوی جیسے شاعروں نے مشاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کیا اور مشاعروں کے وقار کو بھی قائم رکھا۔ اردو تہذیب میں پلے بڑھے سامعین ایک زمانے میں روش صدیقی کی فارسی تراکیب سے سخی شاعری کو مشاعروں میں سنتے بھی تھے اور داد و تحسین سے نوازتے بھی تھے۔

صبا کو اس گلِ رعنا سے ہم سخن پا کر
یہ سوچتا ہوں کہ موضوع گفتگو کیا ہے
یا پھر نشور واحدی کے یہ اشعار بھی مشاعروں کے پلیٹ فارم سے ہر خاص و عام تک پہنچے۔

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آتا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ، نہ کہیں مرا ٹھکانہ
دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
مشیر جھنجھانوی، فنا نظامی کانپوری، قمر مراد آبادی اور بیکل اتساہی جیسے شعرا نے جہاں ایک طرف شعری تقاضوں کا خیال رکھا وہیں عوامی مقبولیت کے پیش نظر بھی اشعار کہے۔ اب مشاعرے شہروں سے نکل کر قصبات اور دیہاتوں تک پھیل گئے۔ مشاعروں کا دائرہ بڑھنے لگا۔ مشاعروں میں سامعین کی تعداد بڑھنے لگی۔ مشاعرے رفتہ رفتہ ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کرنے لگے۔ ایسے میں ناظم مشاعرہ کی ذمہ داریاں بڑھنے

لگیں۔ اسی ماحول میں یہ اشعار کہے گئے۔

میں بھی کسی کی زلف سنوارے چلا گیا
کچھ ضد سی ہو گئی تھی نسیم سحر کے ساتھ
(مشیر جھنجھانوی)

بے ادب ہم سے نہ اے گردشِ دوراں ہونا
ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا
(قمر مراد آبادی)

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا مرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل تنہا
(بیکل اتساہی)

ترک تعلقات کو اک لمحہ چاہیے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا
(فنا نظامی کانپوری)

اب اس ماحول میں نظامت نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ اب مشاعروں میں سرمایہ کاری ہونے لگی۔ گانے بجانے کا چلن بھی عام ہونے لگا۔ اب شاعر کا تعارف ایک فن بن گیا۔ اب مشاعرے کی کامیابی ناکامی کافی حد تک ناظم مشاعرہ کے کاندھوں پہ آ پڑی۔ یوں تو یہ حالتِ مجبوری کوئی بھی شاعر نظامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے اور دیتا بھی ہے۔ منتظمین ایک فہرست ناظم مشاعرہ کے ہاتھوں میں پکڑا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اس فہرست میں یہ ترتیب بھی ہوتی ہے کہ مشاعرے میں سب سے پہلے کون شاعر اپنا کلام سنائے گا اور کس شاعر کو فجر کی اذان کے وقت اپنا کلام سنانا ہے۔ ناظم مشاعرہ یکے بعد دیگر شاعر کا نام پکارتا ہے، شاعر مانگ پر آتا ہے، جس قدر چاہے کلام سنانا ہے، پھر دوسرا شاعر آتا ہے، سلسلہ چلتا رہتا ہے، سامعین جمابھیاں لیتے رہتے ہیں۔ مجمع منتشر ہوتا رہتا ہے۔ اسٹیج پر بھی افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔ ناظم مشاعرہ مشینی ڈھنگ سے اپنا کام انجام دیتا رہتا ہے۔ جبکہ ایک کہنے مشق ناظم مشاعرہ شاعروں کے ساتھ ساتھ سامعین کو بھی باندھ کے رکھتا ہے۔ وقت اور حالات

کے مطابق شاعر کو زحمت کلام دیتا ہے۔ مجمع منتشر ہو رہا ہو تو کسی خوش گلو اور خوش شکل شاعرہ کو آواز دیتا ہے اور سامعین کو بیٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سب کمالات جناب انور جلال پوری مرحوم میں موجود تھے۔ وہ بلا کے ذہین، حاضر جواب، بزلہ سخ اور نباض تھے۔ جلال پور کی علمی ادبی فضاؤں نے انور صاحب کی ایسی پرورش کی تھی وہ ہر محفل میں اپنی انٹ چھاپ جھوڑنے میں کامیاب رہتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ قصر نظامت کے چار ستونوں میں تین ستون یعنی عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے دیار فراق و مجنوں گورکھپور سے رہا ہے۔ گورکھپور کے آسمانِ ادب پہ جو چاند ستارے ہمیشہ جگمگ کرتے رہے ہیں ان میں مہدی افادی، ریاض خیر آبادی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ہندی گورکھپوری، پروفیسر محمود الہی، پروفیسر احمد لاری، جناب شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر اختر بستوی، پروفیسر افغان اللہ خان، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ماسٹر احمد گورکھپوری کے ساتھ عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کا نام بھی شامل ہے۔ یہاں جن چند حضرات کا نام لیا گیا ہے وہ محض ایک مثال ہے ورنہ فہرست تو کافی طویل ہے۔ اس فہرست میں بابائے اردو افسانہ منشی پریم چند کا نام بھی شامل ہوگا کہ وہ نارمل اسکول میں لٹچر تھے۔ گورکھپور سے منشی پریم چند کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ انکی بہت سی مشہور تخلیقات کا تعلق گورکھپور سے رہا ہے۔ نارمل اسکول کے احاطے میں جہاں منشی پریم چند قیام پذیر تھے وہاں سے فرلانگ بھر کی دوری پہ عید گاہ مبارک خاں شہید ہے۔ آپ کو منشی پریم چند کی کہانی ”عید گاہ“ تو یاد ہے نا؟ بہر حال ہم تو انور جلال پوری کی نظامت کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اور اس جائزے میں گورکھپور کا ذکر یوں آ جائے گا کہ انور جلال پوری نے اپنی تعلیمی زندگی کے کچھ برس

گورکھپور میں گزارے تھے۔ اور اسی گورکھپور نے ملک زادہ منظور احمد کی بھی پرورش کی تھی۔ جہاں بھی ملک زادہ منظور احمد کا ذکر آتا انور جلالپوری استاد محترم کہا کرتے تھے اور ملک زادہ منظور احمد نے بار بار نظامت میں عمر قریشی کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ اس طرح گورکھپور کی علمی ادبی فضاؤں نے بھی انور جلالپوری کی نظامت کو سنوارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

نظامت کے جن چار ستونوں کی بات ابتدا میں کی ہے وہ چاروں اپنے اپنے انداز کے، اپنے اسلوب کے بادشاہ ہیں۔ اپنے لہجے اور آواز سے پہچانے جاتے ہیں۔ جناب ثقلین حیدر اپنی نظامت کے دوران بیشمار اشعار سناتے تھے۔ انکا حافظہ زبردست تھا۔ بر محل اشعار سے محفل میں جان ڈال دیتے تھے۔ ہزاروں اشعار انکی نوک زبان پہ تھے۔ مشاعروں کا بڑا سے بڑا شاعر اپنا کلام پڑھ کے بیٹھتا اور ثقلین حیدر شروع ہو جاتے۔ شاعر نے جس مضمون کا شعر پڑھا تھا اسی مضمون کو میر انیس نے کیسے باندھا ہے یہ بتانا ثقلین حیدر کا کام تھا۔ جس زمین میں شعر پڑھا گیا ہے اسی زمین میں مصحفی اور ناسخ کے شعر سنا دیتے۔ شاعر جس ردیف قافیہ کا استعمال کرتا اسی ردیف قافیہ میں کبھی داغ دہلوی تو کبھی علامہ اقبال کے اشعار بر محل سنا دیتے۔ مشاعرہ سن رہے ہزاروں سامعین جھوم اٹھتے، واہ واہ کی صدا بلند ہوتی، لوگ ثقلین حیدر کی سخن فنی اور زبردست یادداشت کی داد دیتے۔ لیکن بیچارہ شاعر سردھن کے رہ جاتا۔ جو داد و تحسین اس کے حصے میں آتی تھی وہ ناظم مشاعرہ ثقلین حیدر لوٹ لیتے تھے۔ ثقلین حیدر کی زبردست نظامت کا مننی پہلو یہ تھا کہ شاعر پھیکا پڑ جاتا تھا۔ نظامت چمک جاتی تھی۔

دوسرے کامیاب ترین ناظم مشاعرہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد تھے۔ جنھوں نے مشاعروں کو کسی حد تک ادبی وقار عطا کیا۔ عمر قریشی کے شہر سے ملک زادہ منظور احمد کا بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ ابتدائی اور اعلیٰ

تعلیم گورکھپور میں حاصل کرنے کے بعد کچھ زمانے تک درس و تدریس کا سلسلہ بھی گورکھپور میں رہا۔ پھر اعظم گڑھ اور لکھنؤ میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ ملک زادہ منظور احمد لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے استاد رہے۔ اردو اور انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔ دورانِ نظامت ایک خاص معیار سے گر کر کبھی گفتگو نہیں کرتے۔ کچھ خاندانی روایت، کچھ بزرگوں کی صحبت نے ملک زادہ منظور احمد کو ایک خاص طرزِ گفتگو عطا کیا تھا۔ شاعروں کی شان میں بیجا قصیدہ نہیں پڑھتے اور اول جلول لطیفے سنا کر سامعین کے ذوق کو خراب نہیں کرتے تھے۔ آواز میں قدرتی بھاری پن اور کھٹک تھی اسی لئے مائیکروفون پہ ملک زادہ منظور احمد کی آواز دوسروں کے مقابلے زیادہ بلند اور صاف سنائی دیتی تھی۔ شاعروں کو داد بھی ایک خاص کڑک دار آواز میں دیتے تھے۔ شاعروں کا تعارف کراتے وقت بیجا طوالت سے عام طور پہ بچتے تھے۔

تیسرے کامیاب ترین ناظم مشاعرہ عمر قریشی تھے۔ وہ ہندوستان کے تقریباً تمام اہم شہروں کی ادبی وراثت سے واقف تھے۔ ایک خاص بات انکے حوالے سے یہ ہے کہ وہ کبھی بھی شاعروں میں اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ دورانِ نظامت اپنے الاعداد اشعار بر محل سناتے تھے لیکن بطور شاعر مائیک پہ آکر اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ جبکہ دنیا کو معلوم ہے کہ وہ ایک بہترین شاعر تھے، انکے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ شہر صداء، زخمِ صدا وغیرہ کو بے حد سراہا گیا۔ لیکن انکی عادت تھی کہ وہ شاعروں میں صرف نظامت کرتے تھے۔ ایک اور بات انھیں اپنے ہم عصر ناظموں سے الگ کرتی ہے کہ وہ شاعر کی قابلیت پہ بہت غور نہیں کرتے تھے۔ شاعر کسی سطح کا ہو، بطور ناظم مشاعرہ وہ چاہتے تھے کہ شاعر اسٹیج سے کامیاب و کامران واپس جائے۔ شاعر اور شاعری کمزور ہو تو عمر قریشی کی نظامت اسے سہارا دینے کا کام کرتی تھی۔ کسی طرح شاعر کامیاب ہو

جائے اور مجموعی طور پر مشاعرہ کامیاب ہو جائے یہ عمر قریشی کی کوشش ہوتی تھی۔

چوتھے کامیاب ترین اور عظیم ناظم مشاعرہ جناب انور جلال پوری تھے۔ ملک زادہ منظور احمد کی طرح انور صاحب بھی تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔ لیکن آپ اردو کے نہیں بلکہ فراق گورکھپوری کی طرح انگریزی زبان و ادب کے استاد رہے ہیں۔ جلال پور کے کالج میں بھرپور تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد آپ لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے۔ انور جلال پوری اپنے خاص انداز میں کسی سنت یا ملگ کی طرح مشاعرے کے اسٹیج پر نمودار ہوتے تھے۔ کسی محفل میں یا کسی اسٹیج پر خاموش بھی بیٹھے ہوں تو دیکھنے والا کہہ اٹھے گا کہ کوئی مفکر بیٹھا ہے۔ انکی سوچتی ہوئی دو ذہین آنکھیں اکثر بہت کچھ بیان کر دیتی تھیں۔

مشاعروں میں فنِ نظامت کے چوتھے ستون انور جلال پوری کا رنگ سخن سب سے جدا تھا۔ ثقلین حیدر، ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی سے بالکل الگ انداز تھا جناب انور جلال پوری کی نظامت کا۔ وہ عمر قریشی کی طرح شاعروں کا تعارف انکے شہروں کے حوالے سے نہیں کراتے تھے۔ وہ ثقلین حیدر کی طرح بے شمار اشعار نہیں سناتے تھے۔ اور ملک زادہ منظور احمد سے ذرا کم ادبیت کی راہ اختیار کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر کی طرح وہ بھی جانتے تھے کہ اشعار ان کے خواص پسند ہیں مگر گفتگو عوام سے ہے۔ عوام سے بھی گفتگو کا ایک خاص سلیقہ تھا انور جلال پوری کے پاس۔ وہ سلیقہ تھا کہ عوام ان کی بات سمجھ جائیں اور خواص کے طبع نازک پہ گراں نہ گزرے۔ نظامت کا یہ سلیقہ انور جلال پوری کے ساتھ رخصت ہوا۔ اگرچہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کے بعد کی نسل میں مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے بالکل سناٹا نہیں ہے۔ اپنے زمانے میں معراج فیض آبادی، ڈاکٹر بشیر بدر اور منور رانا بھی اچھی نظامت کیا کرتے تھے۔ لیکن

معراج فیض آبادی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور جہاں تک بشیر بدر اور منور رانا کا تعلق ہے تو اب ان کی صحت اور عمر اجازت نہیں دیتی۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور جناب اقبال اشہر بھی نظامت کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں لیکن یہ دونوں بطور شاعر بھی خاصے مقبول ہیں۔ اس لئے عموماً مشاعروں میں نظامت سے گریز کرتے ہیں یا پھر منتظمین مشاعرہ ہی انھیں ناظم کے بجائے بطور شاعر ہی مدعو کرنا پسند کرتے ہیں۔ مراد آباد سے منصور عثمانی، گورکھپور سے کلیم قیصر، رامپور سے شکیل غوث رام پوری اور دہلی سے (وطن عزیز بجنور) شکیل جمالی و معین شاداب نے عالمی سطح پر بطور ناظم مشاعرہ اپنی پہچان قائم کی ہے۔ عہد حاضر میں دکن کے ممتاز شاعر ڈاکٹر سلیم محی الدین کا خیال ہے کہ اورنگ آباد، پرہی، ناندر اور امراتی کے علاقے سے ابرار کا شرف نے نظامت میں اپنی ہنرمندی سے متاثر کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر احمد کفیل کلکتہ (کولکاتا) میں مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے ڈاکٹر عاصم شاہنواز شبلی سے اہل نظر کو امیدیں وابستہ ہیں۔ ادھر حیدر آباد میں کچھ عرصے تک محمد اسلم فرشوری نے بھی مشاعروں میں ادبی وقار قائم رکھنے کی کوشش کی۔ گلبرگہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی دھرتی ہے۔ گلبرگہ کے علمی و ادبی منظر نامے پر گہری نظر رکھنے والے ادیب ڈاکٹر غضنفر اقبال کے بیان کے مطابق گلبرگہ میں محب کوثر نے ایک زمانے تک یہ کوشش کی کہ مشاعروں کی نظامت میں پھکڑ پن نہ آنے پائے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے بنگلور کے پاس علی پور کی ادبی فضاؤں کو بھی یاد کیا ہے جہاں ناطق علی پوری اور شفیق عابدی علی پوری نے اپنی نظامت سے ہزاروں کو متاثر کیا ہے۔ امید ہے کہ کچھ اور نام ابھر کر سامنے آئیں گے اور انور جلال پوری کی شکل میں قصر نظامت کے چوتھے ستون کے گرنے کے بعد جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے پُر کریں گے۔

□□□



سجے ممبر اشوق

538 kha/238، کھدر، سینٹاپور روڈ، لکھنؤ

موبائل: 9795455897

واقعی بڑے قلمکار تھے انور جلالپوری

بڑے لوگ علاقائی اور لسانی دائروں سے نکل کر کھلی فضا اور ماحول میں کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات اور خواہشات تک محدود نہیں رہتے کیونکہ ان کے سامنے دنیا کی تعمیر و ترقی ہوتی ہے۔ ذات کے حصار اور انا کے خول میں رہنا انہیں پسند نہیں ہوتا۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں عمر عزیز تمام کر دیتے ہیں مگر زبان سے اپنی عظمت کے قصے نہیں سناتے۔ اسی لئے دنیا انہیں عظیم مانتی ہے۔ ایسی ہی ایک عظیم شخصیت تھی محترم انور جلالپوری کی۔

ہمارے بڑے قلمکاروں کا عام عیب یہ ہے کہ وہ قلم کی روشنائی انہیں پر خرچ کرتے ہیں جو تسلیم شدہ ہیں، معتبر و مستند ہیں جب کہ یہ حقیقت سبھی پر واضح ہے کہ غالب و میر یا اقبال پر آپ کتنا ہی لکھ ڈالیں، کیسی ہی عقیدتیں اور محبتیں بچھا کر دیں، ان کی عظمت میں اضافہ ہونے سے رہا۔ ہاں لکھنے والے کی عظمت اور شہرت میں ایک اسرار کا ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔

انور صاحب اس حقیقت سے کما حقہ واقف تھے اسی لئے انہوں نے اقبال اور ابوالکلام آزاد کی عظمتوں کے اعتراف کے ساتھ اپنے اساتذہ، جلالپور کے بزرگ، والد سے قرب رکھنے والے، مدرسہ سے اسکول و کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک ہر ایسے چھوٹے بڑے کا انہوں نے اپنے مضامین میں اچھے الفاظ سے ذکر کیا ہے کہ جن سے انہوں نے کچھ بھی سیکھا، سمجھا یا جانا۔ حد یہ ہے کہ اپنے عہد کے کم

معروف، گمنام اور نوخیز شعراء پر بھی انہوں نے فراخ دلی سے قلم کی روشنائی خرچ کی۔ حامد بہراچی، راجیوراز، منے بخشی، قمریاب جیلانی، ارشاد گورکھپوری اور تشنہ اعظمی بھی ان کے پیش نظر رہے اور وہ بھی جو کہ ان کے والد کے بے تکلف احباب تھے۔ ہر روز بعد مغرب مکان کے باہر بنے چبوترے پر بے تکلف محفلوں کا حصہ رہتے تھے۔ ایسے لوگوں میں حاجی محمد یونس، حاجی عبدالصمد، حاجی نور محمد، صوفی دوست محمد، منشی رجب، مولوی شفیق احمد، ابو سحر، پیر محمد، احمد حسین، منشی امانت حسین، منگر بابو، عبدالرحمن، حافظ شمس الدین، عبدالحق، حافظ محمد ابراہیم کے نام بجا طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ ناموں کے فخر یہ ذکر کے ساتھ انور صاحب کا قلم دیگر کام کی باتیں بھی لکھتا ہے جس سے بچپن میں ان کی تربیت، والد گرامی کے رائج عمل، ذہنی نشوونما اور بعد کے عادات و اطوار کی گرہیں کھلتی ہیں اور بہت کچھ آئینہ ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ فرمائیے:

’میں نے ابھی جن ۱۵ عدد اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے، یہ لوگ اپنے وقت میں میرے قصبہ کی آن، بان اور شان تھے۔ میرے گھر کے باہری حصہ میں بنے چبوترے کو یہ فخر حاصل تھا کہ یہ بزرگ ہر شام بعد مغرب اپنا قیمتی وقت یہاں صرف کرتے تھے۔ یہ حضرات نہ صرف میرے والد کے ہم عصر اور

دوست تھے بلکہ میری تربیت میں ان میں سے بیشتر حضرات کی شفقتیں شامل ہیں۔ میرے والد اپنی حیات میں مجھ سے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ دیکھو میرے دوستو اور مخلصین کے خاندان کے لوگوں سے ہمیشہ بہتر تعلقات رکھنا۔ خدا کا شکر ہے میں ابا کی ہدایات پر آج بھی عمل پیرا ہوں۔‘

انور صاحب نے تا عمر والد کی ہدایات کو زور اور راہ کے طور پر ہمراہ رکھا۔ بڑوں کے عزت و احترام کے ساتھ چھوٹوں پر شفقتیں لٹاتے رہے۔ مشاعروں کے اسٹیج پر کار نظامت کو سنبھالا تو اسے بھی اپنی محنت، لگن اور پیہم ریاض سے انتہا تک پہنچا دیا۔ اس سلسلہ میں جواں سال صحافی قاضی عبدالرحمن کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ یہاں لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

’آواز کے شہنشاہ عمر قریشی کی آواز میں ایسا جادو تھا کہ لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ میں بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہوں۔ میدان نظامت میں عمر قریشی اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے ہی میں نے کسب فیض کیا۔ انہیں چہانوں کی روشنی میں میرا وجود نظامت منور ہے۔ دونوں میری شخصیت میں سما گئے ہیں۔ جو میری خوش بختی ہے۔‘

انور جلالپوری نے یہ اعتراف پہلی مرتبہ نہیں کیا ہے بلکہ تحریر و تقریر میں متعدد جگہ وہ ان حقائق کا

بر ملا اظہار کرتے رہے ہیں جس سے ان کا قد بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور وہ کبھی اظہار حقیقت سے نہیں ہٹکے۔ انور صاحب کی نثر کے اصل جوہر روشنائی کے سفیر نامی کتاب میں کھلتے ہیں۔ بعد کی کتابوں میں وہ اتنی توانا اور طاقتور نثر نہیں لکھ سکے۔ ’میں خود کو باندھنے میں کئی بار کھل گیا‘ عنوان کے تحت صفحہ ۳۸ پر یوں رقم طراز ہیں:

’مشاعروں کے اسٹیج پر آغاز مشاعرہ پر علمی و ادبی تقریر کرنے کی تقلید میں میں نے محترم ملک زادہ منظور احمد کو دیکھ کر کی۔ حالانکہ میرے بزرگ اور پیشرو عمر قریشی صاحب بڑے ڈرامائی انداز اور افسانوی انداز میں شعراء کا تعارف کراتے تھے۔ کم عمری میں ان کا یہ انداز مجھے متاثر کرتا تھا مگر میں نے یہ انداز اور طریقہ اختیار نہیں کیا۔‘

وہ مزید لکھتے ہیں:

’وہ نوعمری کے زمانے کا طلسم تھا جو نظامت کا چہرہ نہیں بلکہ غازہ تھا۔‘

مذکورہ بالا اقتباس واضح کرتا ہے کہ انور صاحب پر عمر قریشی کی نظامت کا جو سحر تھا وہ قائم نہیں رہا جب کہ ملک زادہ منظور احمد کے طرز خطابت و نظامت کا ان کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنے ایک اہم مضمون ’جسے لکھنا ضروری تھا جسے پڑھنا ضروری ہے‘ میں اس اعتراف کو مجبور ہوئے۔

’ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے مجھے

جذباتی لگاؤ ہے۔ میرے اس والہانہ لگاؤ کا سرچشمہ میرے والد گرامی ہیں۔ غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ جب قصبہ ٹانڈہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں علالت کے باوجود حضرت جگر مراد آبادی تشریف لائے تھے۔ مشاعرہ کے شوق اور جگر صاحب کو دیکھنے کے اشتیاق میں میرے والد ۳۵ کلومیٹر کے فاصلہ

پر واقع ٹانڈہ گئے تھے۔ دوسرے دن حسب عادت میرے دروازے کے سامنے چوہترے پر احباب کی محفل سبھی تو کسی نے مشاعرے کی روداد پوچھی، جس پر میرے والد نے بتایا۔ بھی مشاعرہ تو اچھا تھا ہی مگر ایک نوجوان جس کا نام ملک زادہ منظور احمد تھا، اس کی گفتگو اور تقریر نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد تازہ کرا دی۔ یقین جانے، یہ جملہ آج بھی میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔‘

درحقیقت والد کے منہ سے ادا ہوئے ان تحسین آمیز جملوں اور عقیدتمندانہ اظہار نے انور صاحب کو ملک زادہ منظور احمد کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ وہ تادم آخر انہیں استاد کہتے نہیں ہٹکے۔

احسان شناسی کے یہ جذبات پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی ذات والا صفات تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ زندگی میں جس کسی نے جہاں جس منزل پر، جس حد تک ان کا ساتھ دیا وہ اسی حد تک اظہار ممنونیت سے پیش آئے اور تحریر و تقریر میں اظہار حقیقت سے گریز نہیں کیا۔ پرائمری اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کے اعلیٰ درجات تک، حد یہ ہے کہ مکتب کے دنوں کے اساتذہ کا انہوں نے عزت و احترام سے اپنے مضامین میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ ثبوت کے طور پر ’روشنائی کے سفیر‘ میں شامل یہ مضامین ’یہ بستیاں ہماری‘ میں خود کو باندھنے میں کئی بار کھل گیا، جسے لکھنا ضروری ہے جسے پڑھنا ضروری ہے کو بغور پڑھا جاسکتا ہے۔

معمولی معمولی واقعات کو تفصیل سے لکھنا، کسی منزل اور مقام پر پہنچ کر ابتدائی ساتھیوں، ساتھ میں گلی، ڈنڈا کھیلنے والوں، مکتب میں تعلیم دینے والے مولوی صاحب، ابتدائی درجات کے اساتذہ اور والد کے ہمراہ بیٹھنے والوں کا حسب مراتب ذکر کرنے والا معمولی نہیں ہو سکتا۔

قدرت اسے اس کی انہیں خوبیوں کے سبب نوازتی ہے اور ایسا نوازتی ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ انور صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ قدرت نے انہیں ان کے علم اور منصب سے زیادہ نوازا۔ شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ انور صاحب سے قبل بھی خاصی بڑی تعداد میں صاحبان علم نے کیا ہے۔ کام نثر میں بھی ہوا ہے اور شاعری میں بھی! صلاح الدین عرف صلیو چودھری کی یہ منظوم کاوش ۲۰۱۳ء میں سامنے آئی ہے۔ لیکن قدرت انور صاحب پر مہربان تھی لہذا ان کی منظوم کاوش کو ہر سطح پر سراہا گیا۔ انہیں ’یش بھارتی‘ بھی ملا اور ’پدم شری‘ بھی اور ملنا بھی چاہئے کیونکہ اچھا انسان ہی اچھا فنکار ہوتا ہے۔ انور بھائی اس پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں خلوص و ایثار اور پیہم کام کرتے رہنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مشاعروں کے اسٹیج پر عموماً بڑے مشاعروں کا رویہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ غیر معروف شعراء کو نہیں پہچانتے۔ ناظمین مشاعرہ کا رویہ تو اور بھی خالمانہ ہوتا ہے مگر انور صاحب اپنے منصب کے تئیں ایماندار تھے۔ وہ نوجوان کو سجا کر پیش کرتے، حوصلہ بخش جملوں سے ان کے قدموں کو جمانے کی حتی الامکان کوشش کرتے تھے۔ ان کے اس مخلصانہ عمل کے سبب ہی عوام و خواص میں مقبولیت کے ساتھ انہیں نوجوانوں کا التفات اور قرب بھی نصیب ہوا۔

مشاعروں کے دلچسپ واقعات، زندگی کے نشیب و فراز، نیرنگیاں اور محرومیاں بڑے سمجھے جانے والے شعراء کی کمزوریاں، گمنام و گمنام شعراء کی خوبیاں، نوجوانوں کی مخفی صلاحیتیں، قصبات و دیہات کی فضا، ماحول اور تہذیبی رویوں کا فرق، ترقی یافتہ ممالک میں اردو کے فروغ کے اسباب، ان کی فکر، انداز ترقی کی وجوہ اور ہماری تنزلی کے اسباب، اپنی ۳۸ سالہ تدریسی زندگی کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھ سکتے تھے جو کہ دنیا کے بڑے قلم کاروں نے لکھا اور جو بعد

میں نہایت دلچسپی سے پڑھا گیا۔ قدرت اللہ شہاب کا 'شہاب نامہ' ممتاز مفتی کی 'الکھنری' اور 'علی پور کالٹی' کے بعد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی 'رقص شرر' اور قیصر تمکین کی 'خبرگیر' کو سوشل میڈیا کے دور میں بھی لوگ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں۔

ان کی زندگی سے متعلق 'روشنائی کے سفیر' نامی کتاب میں ۳ مضامین ایسے شامل ہیں جو انور صاحب کی زندگی، والدین کی مشقت، جفاکشی، ایمانداری، تہذیبی روپے، قصبہ کا گنگا جمنی ماحول، معاشی صورت حال، تعلیم کا آغاز، مکتب سے علی گڑھ یونیورسٹی تک تعلیمی مراحل کی روداد کے علاوہ بھی بہت سی ایسی باتیں درج ہیں کہ جنہیں مزید وسعت بخشنے کی ضرورت تھی مگر مضمون کی طوالت یا تنگی وقت کے باعث تفصیل طلب باتوں کو اس طرح سمیٹا گیا ہے کہ جیسے سمندر کو کوڑھ میں بھر دیا گیا ہو۔ اس بات کا احساس انور صاحب کو بھی تھا، اسی لئے وہ لکھتے ہیں۔ سچ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھ دیا اور یہ بھی سچ ہے کہ بہت کچھ نہیں لکھا۔ آنے والا وقت بھی بہت سے تجربات اور مشاہدات دے گا اور نتائج نکلیں گے۔ انشاء اللہ پھر کبھی اپنی بندھی ہوئی زندگی کی گرہیں کھولوں گا۔

(میں خود باندھنے میں کئی بار کھل گیا، روشنائی کے سفیر، ص ۵۳)
وہ ۱۸ کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے مگر

شریمد بھگوت گیتا پر ان کے کام نے ان کی شہرت کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ 'اردو شاعری میں گیتا' جناب انور جالپوری کا ایسا کارنامہ ہے کہ جو زبان و بیان کی روانی، سلاست اور خوبی کے سبب ہر پڑھنے والے کو گرویدہ بنا لیتا ہے۔ انور جالپوری عام آدمی نہ تھے۔ انہیں گیتا کا گیان حاصل ہو گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گیتا کا صحیح گیان نعمت عظمیٰ ہے، جسے یہ گیان حاصل ہو اور وہ اس گیان سے کما حقہ دنیا کو واقف کرانے کا اخلاقی، قلمی و علمی فریضہ انجام دے، وہ عام آدمی کی صف سے نکل کر بہت بلند ہو جاتا ہے۔ انور صاحب نے اپنے عمل سے یہ بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔

دیکھئے، انور جالپوری نے کس مہارت، سلیقہ اور ہنرمندی سے پہلے باب میں جنگ کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ وہ میدان جو تھا جنگ ہی کے لئے وہیں سے جلے دھرم کے بھی دئے ہمیں فخر بھیشم پتاماں پہ ہے کہ جن کا اثر ساری دنیا پہ ہے مگر اپنے دشمن بھی کچھ کم نہیں انہیں مرنے جینے کا کچھ غم نہیں وہاں پانڈوؤں کی عجب شان ہے کہ لاکھوں میں بھی ان کی پہچان ہے وہ چمکے تو شرما گیا شیر بھی وہ گرے تو غش کھا گیا شیر بھی

پتاماں کا بچنے لگا شنگھ جب تو میدان میں گھبرا گئے سب کے سب وہی شنگھ جو آسمانی بھی ہے حقیقت بھی ہے اور کہانی بھی ہے وہی شنگھ پانچ جن ہے جس کا نام دکھایا اسی شنگھ نے اپنا کام مطالعہ کے شائقین کو ہر باب بلکہ ہر صفحہ پر وہی روحانی کیفیات ملے گی جو کہ پہلے باب کی پہلی سطر سے شروع ہوتی ہے۔ ہر باب دوسرے اور دوسرا تیسرے کو پڑھنے پر آمادہ کرتا رہے گا۔ اس طرح سلسلہ منقطع کئے بغیر کتاب ایک نشست میں ختم ہو جائے گی۔ پلک جھپکتے اٹھارہ ابواب ختم ہو جائیں گے۔ یہی بھگوت گیتا کا کمال ہے کہ پڑھنے والا مزید تشنگی محسوس کرتا ہے۔ میرا ب ہونے کی خواہش قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہنے پر آمادہ کرتی ہے اور یہی آمادگی منزل مقصود تک پہنچنے کا سبب بنتی ہے اور ہر انسان بقدر ظرف و استعداد کسب نور کرتا ہے۔

انور صاحب کو شریمد بھگوت گیتا کو پڑھنے اور اس کی مشتمی کے لئے صلاحیتوں کے استعمال کا بہتر موقع ملا تو یہ معمولی سعادت نہیں تھی۔ اس خوش بختی پر انہیں جتنا نوازا جاتا، جتنی اور جن الفاظ میں ستائش کی جاتی کم تھی۔

□□□

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزاز یہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزاز یہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔



امین احسن

محلہ قاضی پورہ ٹانڈہ، امبیڈ کرنگر

موبائل: 9839745971

زبان سیر کا غیر معمولی فنکار انور جلالپوری

ادا کیا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں انھوں نے اپنے علمی اثاثے میں اضافہ کے لئے ۱۹۷۸ء میں اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے ایم۔ اے۔ (اردو) کی ڈگری حاصل کی ان کا تعلیمی سفر یہیں آکے ٹھہر نہیں گیا بلکہ ۱۹۸۴ء میں اودھ یونیورسٹی میں ہی پی ایچ ڈی کیلئے رجسٹریشن کروایا جس کا موضوع تھا ”گیتا کا منظوم اردو ترجمہ اور اس کا تنقیدہ جائزہ“۔ لیکن بعض ناگزیر اسباب و حالات کے بنا پر ان کا ریسرچ ورک (تحقیقی کام) پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن ان کا مزاج ستاروں سے آگے جہاں اور بھی جیسا تھا۔ اس تحقیقی کام کی بازیافت گیتا کے منظوم اردو ترجمہ میں پوری کردی۔

ان کی پوری زندگی عمل، جہد مسلسل، دیانت داری، شرافت اور فرض شناسی کی بہترین اور بے نظیر مثال ہے۔ ان کے جیسی نادر الوجود شخصیتیں کبھی کبھی خاک کے پردے سے نکلتی ہیں اور حد امکان سے آگے اپنی قادر الکلامی، جادو بیانی اور سحر انگیزی کا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی علمیت اور دانشورانہ لیاقت و صلاحیت سے اپنے افکار و خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ صفحہ قرطاس پر روشنائی سے کچھ اس طرح پرافشاں کیا ہے کہ نقش ایسے بنے کہ منائے نہ بنے کے مترادف ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ بصیرت، دو اندیشی نگاہِ مستانہ اور ذہانت کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس یہ ستارہ جگنو نما اپنی روشنی بکھیر کر ۲ جنوری ۲۰۱۸ء کو اس دارِ فانی سے کوچ

نہیں دی تھی پھر بھی انور صاحب انھیں اپنا استاذ گردانتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں ایم۔ اے۔ (انگریزی) میں داخلہ لینے کے لئے زمانہ ساز ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یعنی شہر سیر کی طرف رخ کرتے ہیں انور صاحب ابتدائی دنوں سے ہی تعلیم کے ساتھ ساتھ بیت بازی، تقریری اور تحریری پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور سرگرم عمل رہتے تھے۔ قیام علی گڑھ کے دوران انھوں نے یونیورسٹی میں ایک ادبی تنظیم ”ہمراہی“ کی بنیاد ڈالی جس میں شہرت یافتہ شاعر جناب بشیر بدر وغیرہ حصہ لیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء ایم۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد وطن عزیز کی طرف واپس لوٹتے ہیں اور تلاشِ معاش کے لئے سرگرداں و سرگرم عمل ہو جاتے ہیں ۱۹۶۹ء ۱۹۷۰ء میں بابا بروا داس ڈگری کالج پرویا آشرم جلالپور میں شعبہ انگریزی میں ایڈ باک پر لکچرر ہو جاتے ہیں جہاں مستقل نوکری کے لیے امکانات تو تھے لیکن کالج شہر سے دور واقع ہونے اور مشاعروں کی مصروفیت کی وجہ سے انھیں کافی دشواریوں کا سامنا تھا۔ اسی زمانہ میں ۱۹۷۳ء میں نریندر دیوانٹر کالج میں انگریزی کے لیے ایک عہدے کا اشتہار نکلا انور صاحب بھی عرضی گزاروں میں شامل ہو گئے۔ انٹرویو ہوا اور فال نیک انور صاحب کے نام نکلا۔ انور صاحب ایک فرض شناس، ذمہ دار، خلیق و شفیق، متین و سنجیدہ اور ملنسار استاد تھے۔ طلبہ سے ان کا رشتہ نہایت مشفقانہ اور دوستانہ ہوا کرتا تھا مشاعروں کی مصروفیت کے باوجود بھی انھوں نے حق استاد ی بخوبی

انور صاحب کا ادبی دنیا میں سکندرانہ عظمت حاصل کرنے کا سفر خاصہ طویل اور جدوجہد کی بے نظیر مثال ہے۔ ان کی پیدائش ۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو قصبہ جلالپور ضلع امبیڈ کرنگر (فیض آباد) میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد کا نام حافظ محمد ہارون تھا جو اپنے علاقے کی ایک مقتدر اور مانند ہستی تھے شرافت اور ادب نوازی ان کا شیوہ تھا ان کا دولت کدہ احباب علم و دانش کا محور و مرکز تھا بعد نماز مغرب دانشوروں کا اجتماع اور سیاسی و سماجی اور ادبی مسائل پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ قبل نماز عشاء اور بعد نماز عشاء دیر تک چلتا رہتا تھا جس نے آگے چل کر انور صاحب کی ذہنی تربیت اور تہذیبی شخصیت میں اہم رول ادا کیا۔

ان کے تعلیمی سفر کا آغاز مدرسہ کرامتیہ دارالفیض جلالپور سے ہوتا ہے ابتدائی تعلیم کے بعد ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم قصبہ جلالپور کے مشہور کالج نریندر دیوانٹر کالج سے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۴ء میں حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے شہر شیلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور شیلی نیشنل ڈگری کالج اعظم گڑھ میں داخلہ لے کر ۱۹۶۶ء میں گریجویشن کی سند حاصل کرتے ہیں۔ جہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب سے ہوتی ہے۔ جو اس زمانے میں شعبہ انگریزی میں لکچرر کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن یہ ساتھ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا کیوں کہ ملک زادہ صاحب گورکھپور یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں منتقل ہو چکے تھے گو کہ ملک زادہ صاحب نے انھیں تعلیم

کر گیا اور مالک حقیقی سے جا ملا۔

انور صاحب کے علمی اور ادبی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے جس کا اجمالی جائزہ لیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات محض پندرہ سال کی عمر میں کی۔ تقریباً ۵۵ سال پر محیط ان کا ادبی اثاثہ کافی طویل ہے انہیں نثر و نظم دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی اردو اور ہندی میں درج ذیل تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

(۱) کھارے پانیوں کا سلسلہ (غزلیات)

(۲) خوشبو کی رشتے داری (غزلیات)

(۳) جاگتی آنکھیں (ہندی) (غزلیات)

(۴) روشنائی کے سفیر مجموعہ مضامین

(۵) اپنی دھرتی اپنے لوگ (ہندی) مجموعہ مضامین

(۶) ضرب لا الہ، جمال محمد، بعد از خدا، حرف ابجد

(نعتیہ شاعری کے مجموعے)

(۷) راہ رو سے رہنما تک (منظوم سیرت خلفائے

راشدین)

(۸) توشہ آخرت (پارہ عم کا منظوم ترجمہ)

(۹) اردو شاعری میں گیتا نچلی (منظوم ترجمہ)

(۱۰) اردو شاعری میں رباعیات خیام (منظوم ترجمہ)

(۱۱) اردو شاعری میں گیتا (منظوم ترجمہ)

(۱۲) سفیران ادب (مجموعہ مضامین)

(۱۳) قلم کا سفر (مجموعہ مضامین)

(۱۴) گوتم بدھ کی حیات و تعلیمات کا منظوم ترجمہ

(غیر مطبوعہ)

مذکورہ بالا تصانیف پر تنقید اور تبصرہ کے لئے

وقت درکار ہے۔ یہاں صرف سرسری جائزہ لینا

مقصود ہے۔ انور صاحب کی شخصیت اور فن پر کشمیر

یونیورسٹی میں پروفیسر منہاس کی نگرانی میں ڈاکٹر سلیم کو

پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ

بیرون ملک پاکستان میں بھی کراچی یونیورسٹی میں ایک

تحقیقی کام جاری ہے یہی نہیں انور صاحب کے غزلوں کے ۱۰۰ اشعار کا منظوم انگریزی ترجمہ ڈاکٹر سرفراز صاحب شبلی کالج اعظم گڑھ نے Rays of Thought کے نام سے کیا ہے جو ان کی ادبی کارناموں کی اہمیت اور افادیت کی دلالت کرتا ہے۔ حکومت ہند، ریاستی حکومتوں اور ادبی تنظیموں نے بھی انھیں درج ذیل ایوارڈس اور اعزازات سے سرفراز کیا ہے۔

(۱) بیش بھارتی سامان ۱۶-۲۰۱۵ء، اتر پردیش سرکار

(۲) قومی یگیتی ایوارڈ (اردو شاعری میں گیتا)

۲۰۱۵ء، اتر پردیش اردو اکادمی

(۳) اردو شاعری میں گیتا، ۲۰۱۵ء، بہار اردو اکادمی

(۴) اتر پردیش گوروسمان، ۲۰۱۲ء

(۵) فراق سامان، ۲۰۱۲ء

(۶) مائی رتن سامان، ۲۰۱۱ء

(۷) کھارے پانیوں کا سلسلہ ۱۹۸۵ء، اتر

پردیش اردو اکادمی

(۸) خوشبو کی رشتے داری، ۲۰۱۱ء، اتر پردیش اردو

اکادمی

(۹) ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد سے ایوارڈ اور سامان،

۲۰۰۲ء

(۱۰) افتخار میر ایوارڈ، ۲۰۰۳ء، میر اکادمی لکھنؤ

(۱۱) مگمر مہوتسا ایوارڈ، ۲۰۰۳ء

(۱۲) نذیر بنارس ایوارڈ، ۲۰۰۶ء

اس کے علاوہ انور صاحب مختلف ادبی تنظیموں

کے صدر اکادمی کے ممبر اور ترپردیش مدرسہ کے

چیئرمین بھی رہ چکے ہیں اور کئی میگزین اور رسالوں کی

ادارت کی ذمہ داریاں بھی سنبھالی۔ ان کے انتقال

کے بعد بھارت سرکار نے انھیں ”پدم شری“ ایوارڈ سے

نوازا جو ہندوستان کا ادبی خدمات کے لئے سب سے

بڑا انعام ہے۔

انور صاحب نے اصناف شاعری میں نظم،

رباعی، غزل اور نعت وغیرہ پر کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ ترجمہ نگاری اور نثری تخلیق میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ان کی تقاریر تاثراتی تنقید کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ان تمام کارناموں پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ بہر حال ان کی ابتدائی دور کی نظموں سے کچھ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

آؤ پھر عہد کریں دیش کی رکشا کے لئے

آؤ پھر عہد کریں امن و اہنسا کے لئے

آؤ پھر عہد کریں رونق دنیا کے لئے

مادر ہند کی یگیتی و ایکتا کے لئے

آؤ طے کر لیں کہ اب جنگ نہ ہونے دیگے

عرصہ زیت بشرنگ نہ ہونے دیگے

سیاسی تنزلی اور اخلاقی زوال و عصری حسیت پر

مبنی نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

اندھے بنے ہیں رہنما

چشم بصیرت بے ضیا

بہرے بھی سنتے ہیں صدا

پرور دگار دو جہاں

مجھ کو بتا جاؤں کہاں

انور صاحب کی نظم شاعری کی یہ چند مثالیں

ہیں، جن میں عصری حسیت کا عنصر غالب ہے اور

نہایت عمدگی کے ساتھ سمویا بھی گیا ہے۔ ملک کی

سیاست اور قومی یگیتی کے لئے آج بھی اس طرح کی

نظموں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی چار پانچ دہائی قبل

تھی۔ ساختاتی پہلو سے ان نظموں میں تازگی اور

زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ انور صاحب بیک

وقت اردو، ہندی، عربی، انگریزی، فارسی اور

سنسکرت وغیرہ زبانوں پر غیر معمولی قدرت رکھتے

تھے اسی لئے انھوں نے رباعیات خیام، گیتا نچلی، گیتا

اور گوتم بدھ کی تعلیمات کا منظوم ترجمہ کیا۔ اردو

شاعری میں ”گیتا“ ان کا کلیدی اہمیت کا منظوم ترجمہ

ہے جس پر انھیں پدم شری ایوارڈ حاصل ہوا۔ گیتا کے حوالے سے چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری اور ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ گیتا کا اولین ترجمہ شہنشاہ اکبر کے درباری اور دانشور ابوالفضل فیضی نے فارسی میں کیا تھا۔ اس کے بعد تو ترجموں کا گویا دبستان ہی کھل گیا۔ اس نظم کے اب تک تقریباً ۵۰ ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں نظیر اکبر آبادی، حسرت موہانی، یگانہ چنگیزی، حکیم محمد اجمال خاں (نغمہ خداوندی) اور خواجہ دل محمد وغیرہ نے کیا۔ ۱۹۲۳ء میں احمد حسن الدین صاحب نے بھی ایک ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر حسان الدین (آئی۔ اے۔ ایس) نے بھی ”نغمہ الودیات“ نام سے ۱۹۴۵ء میں گیتا کا ترجمہ کیا تھا۔ جو کہ ۱۸ ابواب سات سو ایک شلوکوں پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۱ء میں پاکستان میں بھی ایک ترجمہ ”نغمہ الہی“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مشہور اردو شاعر رئیس امروہوی نے ۱۹۹۹ء میں گیتا کا ترجمہ کیا جسے بعد میں رئیس اکیڈمی نے شائع کیا۔

اس طرح اردو میں گیتا کے منظوم ترجموں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن انور صاحب کے ترجمے کی اہمیت الگ ہے کیوں کہ انھوں نے اسے بے حد آسان زبان اور شعری آہنگ میں منتقل کیا ہے۔ اس کی بحر ”مترقارب“ ہے جس میں مشکل اور دقیق الفاظ کا گزر آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے فلسفہ گیتا کو اتنا آسان اور عام فہم کر دیا ہے کہ قاری مضمون کی روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔

گیتا کی اشعار سلاست روانی اور زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت سادہ آسان اور عام فہم ہیں۔

ایک طرف انور صاحب نے لطیف سماجی احساسات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر ایسا سرمایہ

تشکیل کیا ہے کہ جس کے بطن سے تہذیب کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور نسلوں کو سیراب کرتے ہیں اور دوسری طرف انھوں نے ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کے موقع پر مرزا غالب جو نیر ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی جو کہ جالپور کے قلب میں واقع ہے اب یہی جو نیر ہائی اسکول مرزا غالب انٹر کالج کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ ان کی علم دوستی دور اندیشی اور قوم پرستی کی غمازی کرتا ہے یہاں تشنگان علم کسب فیض کر رہے ہیں، انور صاحب چاہتے تو اس موقع پر کسی شاندار جشن کا اہتمام کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ کالج غالب صدی پر ان کو سچی خراج عقیدت کا نادر و نایاب نمونہ ہے۔ انور صاحب اس کالج کے تاحیات صدر بھی رہے۔

انھوں نے شاعری صرف جذبات اور احساسات کے اظہار کے لئے نہیں کی بلکہ جذبات اور احساسات کو تہذیب بنانے کے لئے کی ہے۔ ان کے یہاں لفظ وسیلہ بن جاتا ہے، جملہ و شعر سلیقہ بن جاتا ہے اور تحریر تہذیب بن جایا کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی تلخ و شیریں سچائیوں اور حقیقتوں کے اعتراف کی خوشبو چلی بسی ہے۔ ان کی شاعری میں خود داری اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

زلف کو ابر کا کٹرا نہیں لکھا میں نے
آج تک کوئی قصیدہ نہیں لکھا میں نے
جب مخاطب کیا قاتل کو تو قاتل لکھا
لکھنوی بن کے مسیحا نہیں لکھا میں نے

تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے مسائل، ہجرت، فسادات، عدم استحکام، ٹوٹے بکھرتے رشتوں، انسانی قدروں کی پامالی، مسئلہ امن و سلامتی جیسے موضوعات کو ان کی حساس طبیعت نے بہت گہرائی اور جذباتیت کے ساتھ محسوس کیا ہے مثلاً

نہ جانے کون سی مصلحت کے قیدی تھے

چلا کے تیر جو اپنی کمان چھوڑ گئے
ہمیں گلہ بھی ہے انور تو صرف ان سے ہی
جو لوگ خوف سے ہندوستان چھوڑ گئے
ہجرت کے چراغوں سے کیا تھا جسے روشن
اس شہر کراچی میں تماشا بھی ہمیں ہیں
تم پیار کی سوغات لئے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا
آج کل تنہا سفر دل میں دھڑکتا ہے بہت
بے یقینی کا یہ منظر دیکھئے کب تک رہے

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور اکیسویں صدی میں سماجی تانہ بانہ بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوا ہے۔ خود غرضی، مادیت پرستی، تنہائی پسندی، استحصال اور برتریت کے جذباتوں سے پیدا ہونے والے مسائل پر ان کی نظریں مرکوز تھیں۔ حساسیت سے لبریز چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

زندگانی ترا حلیہ کبھی ایسا تو نہ تھا
جیسا اب ہے تیرا چہرہ کبھی ایسا تو نہ تھا
دل کہیں، ذہن کہیں، جسم کہیں، روح کہیں
آدمی ٹوٹ کے بکھرا کبھی ایسا تو نہ تھا
دل سے تڑپ رگوں سے حرارت چلی گئی
ورثے میں جو ملی تھی وہ دولت چلی گئی
کس نے کس سے پیا رکھا ہے
سب نے کاروبار کیا ہے

انور صاحب مسائل حیات اور ہنگامہ زیت سے بخوبی واقف ہیں انھیں حیاتیاتی نفسیات پر گہرا عبور حاصل ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں داخلی کیفیات اور حوادث کائنات ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور ہماری سماعتوں کو پاکیزگی اور تازگی سے معمور کر دیتے ہیں۔ دلوں کو اطمینان و سکون اور طبیعت کو فرحت بھی بخشتے ہیں مثلاً

دل کسی کا ہو مقدس ہے حرم کی مانند
اس عمارت کو گرانے کی سزا پاؤ گے

کچھ وصف تو ہوتا ہے دماغوں میں دلوں میں
یوں ہی کوئی سقراط و سکندر نہیں ہوتا
مسلل دھوپ میں چلنا چرائوں کی طرح جلنا
یہ ہنگامے تو مجھ کو وقت سے پہلے تھکا دیں گے
جو مذہب اوڑھ کے بازار نکلے
ہمیشہ ان اداکاروں سے بچنا
غرض یہ کہ انور صاحب رنگارنگ مضامین کو
شعری آہنگ میں اسلوبیاتی ندرت و سادگی و شگفتگی کے
ساتھ کچھ اس طرح ہم آمیز کیا ہے کہ معیار فن بھی قائم
ہے اور موضوع کو گنجشک ہونے سے بچایا بھی ہے ان
کے یہاں معنی آفرینی کی آئینہ داری درجہ کمال کو پہنچی
ہوئی ہے۔ ان کی فکر و احساس کشادگی ذہن اور دور رس
نگاہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی بصیرت
کا دائرہ محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے وہ ہم نوائے وقت
اور حقیقت نگار بھی۔

انور صاحب کی نثر نگاری بھی اعلیٰ درجے کی ہے
جس کا طویل اور تفصیلی جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں
ہے۔ ان کی نثر شاعرانہ مقناطیسیت کی غمازی کرتی ہے
اور کہیں نہ کہیں رجب علی بیگ سرور، شبلی نعمانی اور
ابوالکلام آزاد کے قلم کے جادو کا احساس کراتی ہے ان
کے نثری کارنامے بھی کچھ کم نہیں ہے بلکہ شہرت دوام
کیلئے کافی ہیں چند اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

”سرسید کی دور اندیشی، حالی کا درد، اکبر الہ
آبادی کے سینے کی تڑپ، مولانا شبلی کے اسلاف سے
عقیدت، مولانا قاسم نانوتوی کی آنکھوں کا نور یہ
سارے عناصر ترکیبی اگر اکٹھا کر دیئے جائیں اس سے
اقبال کا پیکر بن جائے گا..... اقبال کے یہاں
دعائیں نہیں بلکہ عمل کی فاختائیں ہیں وہ مایوسی اور غم
کے شاعر نہیں بلکہ باعمل مجاہدانہ زندگی کے نغمہ گر
ہیں..... اردو میں پہلی مرتبہ اقبال نے شاعری سے
ہدایت، صداقت، سخاوت، شجاعت اور شہادت کا کام
لیا ہے۔ انھوں نے ذہن کی قوت اور روح کی طاقت کو

ہم آغوش کر دیا۔ ان کی شاعری نظر کو نور اور دل کو سرور
بخشتی ہے۔ معرکہ روح و بدن کے اختتام پر روح کی
فتیانی اقبال کی مجموعی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔
(روشنائی کے سفیر بعنوان اقبال کی عبقریت)

۱۹۶۲ء میں قصبہ جالپور کے مشاعرے کی
نظامت مشہور زمانہ ناظم مشاعرہ و شاعر عمر قریشی
صاحب نے کی تھی جس کی روداد انھوں نے روشنائی کے
سفیر میں بعنوان ”میرے ذہن کا پہلا ساحر عمر
قریشی“ میں انور صاحب رقمطراز ہیں.....

”مشاعرہ ختم ہوا۔ صبح ہوئی۔ عمر صاحب
اپنے وطن گورکھپور روانہ ہو گئے مگر میرے قصبے میں
تعریفوں اور تبصروں کا ایک موسم چھوڑ گئے۔ رات
گزر چکی تھی نرم و نازک صبح نو خیز کا چہرہ بھی دھوپ
سے مرجھانے لگا تھا مگر عوام پر تمام شب کا نشہ تھا
کہ اترتا ہی نہیں تھا۔ عمر صاحب کی گل افشانی
گفتار پر تبصرہ کرنے میں جوان و ادھیڑ اور
بوڑھے اپنی عمروں کا فرق بھول گئے تھے۔ نادر
شاہ نے کبھی دلی کو لوٹا ہوگا مگر اس رات تو عمر
صاحب میرے دیار کے سخن فہموں کا دل لوٹ کر
چلے گئے۔“

یہ اقتباس انور صاحب کی جادو بیانی و گل افشانی
اور عبارت آرائی کے نہ صرف مظہر ہیں بلکہ اس طرف
بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ان کی تحریر و تقریر میں عمر
قریشی صاحب کا پر تو صاف طور پر جھلکتا ہے۔ صحیح
معنوں میں انور صاحب نے نظامت کے حوالے سے
اگر کسی کی تقلید کی ہے تو وہ صرف اور صرف عمر قریشی
صاحب کی۔

بحیثیت مجموعی انور جالپوری صاحب ایک کثیر
الہجت اور کارواں صفت شخصیت کے مالک ہیں جن کی
عظمت کا سکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی انفرادیت
کے لئے یکساں طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ وہ بیک
وقت شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، ناقد بھی ہیں اور ناظم

بھی، مفکر بھی ہیں اور مدبر بھی۔ محبت اور امن و رواداری
کے پاسان بھی ہیں اور انسانیت کے علمبردار اور نگہبان
بھی۔ مشترکہ تہذیبی روایت و وراثت کے نقیب و رفیق
بھی ہیں، اور فرقہ واریت، تعصب، تنگ نظری اور
نفرت کے رقیب بھی۔ صاحب علم و دانش بھی ہیں اور
زمانہ شناس بھی۔ فہم و فراست کے مالک بھی ہیں
اور سنگلاخ راستوں کے مسافر اور راہی بھی۔ امن کے
پیغامبر بھی ہیں اور پاسدار یکجہتی و یگانگت بھی۔
راز ہائے حیشہ فرہاد سے آشنا بھی ہیں اور لیائے محبت
کے دم ساز بھی۔ زبان اردو اور شیرینی گفتار کے پیش رو
بھی ہیں اور لفظوں کے جادوگر بھی ایک کامیاب معلم
بھی ہیں اور محافظ خادم اردو بھی۔ جدید عصری میلانات
سے آگاہ بھی ہیں اور قدیم تاریخی دستاویز کے نظر شناس
بھی۔ زمانہ ساز بھی ہیں اور علم و حکمت کے چراغ
بھی۔ غرض یہ کہ انور صاحب ایک ایسے تراشیدہ ہیرے
کے مانند ہیں جو مختلف زوایوں سے روشنی اور قوس
و قزح کے رنگ بکھیرتا ہے، جگمگاتا اور جھلکتا ہے انھیں
لفظوں پر اس قدر ملکہ و قدرت حاصل ہے کہ جب وہ
شاعری کرتے ہیں یا نثر لکھتے ہیں تقریر کرتے ہیں یا
تبصرہ تو لفظ ان کی جلو میں اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ
کبھی رقص کناں ہوتے ہیں اور کبھی سر بسجود۔ ان کے
جملوں اور اشعار میں لفظوں کی ترتیب کسی خوبصورت
پھولوں کے ہار جیسی ہوتی ہے جو اپنی خوشبو اور عطر بیز
کیفیت سے قارئین اور سامعین کو نہ صرف محظوظ کرتا
ہے بلکہ سماعتوں اور دل و دماغ کو تازگی و فرحت اور
سرور انبساط بھی بخشتا ہے۔ ان کی آواز کی غنائیت اور
سحر انگیزی سے بادِ سموم نسیم صبح کے تازہ جھونکوں
میں تبدیل ہو جایا کرتی ہے۔ ان کی تحریر و تقریر اور
شاعری میں دریا کی سی روانی اور پہاڑی آبشاروں کی
کھنک کا احساس ہوتا ہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا
کمال اور طرہ امتیاز ہے۔

انور جالپوری

بھگو دگیتا کے منظوم ترجمے کے اقتباسات

عقیدہ عقیدت جو مجھ میں رکھے
جو دیکھے مجھے چشم ایمان سے
سدا میرے نزدیک افضل وہی
وہی شخصیت کا مکمل وہی
او کتنی کے بیٹے تو اب جان لے
حقیقت مری کیا ہے پہچان لے
جو سمجھیں مجھے مالک کائنات
مجھی میں ہے کل دیوتاؤں کی ذات
ارادوں میں مضبوط ہیں جس کے دل
کریں یاد مجھ کو وہی مستقل
نہ بھولیں مجھے موت کے وقت بھی
کہ ہر پل رہے جس گھڑی سخت بھی
یہاں آ کے ارجن پریشان ہیں
سوالات کر کر کے حیران ہیں
برہم کیا ہے، روحانیت کیا عمل
بتائیں کہ کیسے ہو جیون سفلی
بتائیں مجھے پنج تنوا ہیں کیا
عناصر کو سمجھوں میں کیسے بھلا
سبھی دیوتاؤں کا کیا گیان ہے
زمانے میں کیوں ان کا سامان ہے

ہوس تیاگ، دنیا ہے تیرے لئے
یہ سارا زمانہ ہے تیرے لئے
کرشنا نے تفصیل سے پھر کہا
ہر اک راز ارجن کو سمجھا دیا
مرا جنم لوگوں کے جیسا نہیں
کہ میں خاص ہوں ایسا ویسا نہیں
ازل سے ہوں میں اور اجنما ہوں میں
اکیلا ہوں میں اور تنہا ہوں میں
کرشنا نے ارجن سے پھر یہ کہا
کہ یہ راز مجھ کو بھی دیجئے بتا
کہ کرموں سے دوری بھی معقول ہے
اور اس سے حضوری بھی معقول ہے
مجھے صاف لفظوں میں سمجھائیے
حقیقت ہے کیا اس کو بتلائیے
جواب اس کا کرشنا نے ایسا دیا
کہ ارجن کی الجھن کو سلجھا دیا
ہے ارجن! تپسوی سے یوگی بڑا
جہاں بھر کے گیانی سے یوگی بڑا
میں کہتا ہوں اٹھ یوگ کی راہ لے
کہ اس راستے ہی میں سب کچھ ملے

تھی تیار بھیشم پتاما کی فوج
گر جدار جیسے سمندر کی موج
یہ منظر جو ارجن کو آیا نظر
اٹھایا دھنش اس نے بھی بے خطر
کہا اس نے اے مالک روح و جاں
یہ رتھ لے چلیں فوج کے درمیاں
عجب حال ارجن کی آنکھوں کا تھا
بڑی دیر تک صرف آنسو بہا
تو پھر کرشن نے اس سے پوچھا یہی
کہاں سے ہے سیکھی بتا بزدلی
یہ سب علم سے دور کی بات ہے
جہالت کی، مجبور کی بات ہے
اٹھو جنگ کے واسطے اٹھ پڑو
لئے ہاتھ میں اسلحے اٹھ پڑو
بہت عقل سے ہے بڑی آتما
کہ اس سے بڑا صرف پرماتما
میں ہوں بے عمل ایک پل کو اگر
تو ہو جائے دنیا ادھر کی ادھر
تو اپنی حقیقت کو اب جان لے
ترے پاس کیا کچھ ہے پہچان لے

ہے ارجن! نہ کرگن کی اوگن کی بات
ترے دھیان کا کیندر ہے میری ذات
عقیدت سے تو گیان کی اور چل
اسی سے رہے گا ہمیشہ سفل
میں ہوں ایشور سارے سنسار کا
میں خالق ہوں ہر شکل و آکار کا
میں سورج کی گرمی ہوں بارش ہوں میں
کرم، رحم ہوں اور نوازش ہوں میں
بھلا دوسروں کا جو چاہیں سدا
رکھیں غیر جن سے بہت آسرا
وہ آخر میں مجھ سے ہی مل جائیں گے
کنول انکے دل کے بھی کھل جائیں گے
جہاں حسن ہے شان و شوکت جہاں
مرا نور ہے اس میں جلوہ فشاں
ہے قائم مرے یوگ سے یہ جگت
یہ برہمانڈ میری ہی ہے سلطنت
عجب کیفیت میں پھر ارجن پڑا
خداوند سے اس نے کچھ یوں کہا
پڑھایا جو روحانیت کا سبق
ہوا اس سے ہر شک کا سینہ ہی شق
فقط آپ زندہ ہیں فانی ہیں سب
حقیقت ہیں آپ اور کہانی ہیں سب
دکھا دیں مجھے غیر فانی سروپ
جو ہے علم کا اور گیانی سروپ
کرشنا نے کچھ یوں مخاطب کیا
جو تھا راز ارجن کو بتا دیا

مہرشی ہو یا دیوتا ہو کوئی
مرا جنم کب ہے نہ جانے کبھی
کہ ان کے جنم کا سبب میں ہی ہوں
میں پالوں انہیں ان کا رب میں ہی ہوں
گناہوں سے وہ شخص پائے نجات
ازل سے جو سمجھے کہ ہے میری ذات
تو ارجن نے کیشو سے یہ کہہ دیا
تعلق ہے کیا جسم اور روح کا
ہوا، آگ، آکاش، جل، خاک سے
بدن ہے بنا کتنے ادراک سے
عمل علم کے جتنے بھی ہیں حواس
ابھکار، بدھی کریں ان میں باس
انہیں سے ہے تشکیل اس جسم کی
انہیں سے ہے تکمیل اس جسم کی
یہی گن تو کرموں کا بننے سبب
انہیں کی بدولت تو ہیں کام سب
مگر چپ ہے خاموش ہے آتما
کہ ہے اس کا رتبہ بہت ہی بڑا
سمجھ لیں جو اسکو وہ میرے بنیں
حقیقت کو سمجھیں اسی میں رہیں
انہیں چھوڑ کر جو بنے فحشیاب
وہ پیری جوانی میں ہوں کامیاب
وضاحت سے باتوں کو پھر یوں کہا
خداوند نے سب کو سمجھا دیا
جگت کیا ہے پتیل کا اک پیڑ ہے
بندھی ہے مثالوں سے ہر ایک شے

عجب پیڑ جس کی جڑیں تو ہیں پست
مگر اس کی شاخیں تو اوپر ہیں مست
ہیں پتے کہ جیسے وچن وید کے
حسین اتنے جیسے سخن وید کے
خدائی صفت کے ہیں جتنے بھی گن
مرے منہ سے ارجن انہیں آج سن
پڑھا کر مقدس کتابیں سدا
ریاضت، دیانت سے رکھ واسطہ
نڈر بن مگر صاف رکھ دل کا گھر
سدا تیاگ کر اور خیرات کر
ابھنا، صداقت کو اپنا بنا
تلون مزاجی سے رکھ فاصلہ
ادب سے پھر ارجن مخاطب ہوا
خداوند عالم صفت سے کہا
جنہیں شاستروں سے ہی رغبت نہیں
انہیں ان سے کوئی عقیدت نہیں
ستوگن، رجوگن سے کیا واسطہ
تموگن سے ان کا ہے کیا سلسلہ
شرڈھا کا ان کی ہے معیار کیا
کہیں ان کو ہم لوگ سرکار کیا
مہاراج! مجھ کو ہے بیحد خوشی
کہ جیسے مجھے سلطنت مل گئی
میں خوش ہو کے اعلان کرتا ہوں اب
بتاتا ہوں دنیا کو یہ با ادب
وہیں فتح مندی، مسرت وہیں
کبھی کے لئے شان و شوکت وہیں

تعزیتی نظم

ایک راہی تھا جو میر کارواں بن کر اٹھا
اک سپاہی تھا جو قومی ترجمان بن کر اٹھا
راہ میں دشواریوں کے موڑ بھی آئے مگر
امتحان زندگی میں کامراں بن کر اٹھا
پاس تھا محنت کا زر، اخلاص کی چاندی بھی تھی
ہاتھ اس کا دستگیر بیکساں بن کر اٹھا
شاعر و ناظم کرم گستر، ادب پرور جو تھا
اسکا ہر جملہ ادب کی روح و جاں بن کر اٹھا
شور سے ناقوس کے جب تھی سماعت دم بخود
ایسے عالم میں وہ آواز ازاں بن کر اٹھا
چپ ہوئے جب لب، تو خاموشی لگی کرنے کلام
اسکا ہر انداز بھی ایک داستاں بن کر اٹھا
ایک انور کا جنازہ اور تھی کاندھوں کی بھیڑ
ایک ذرہ تھا جو رشک کہکشاں بن کر اٹھا
ناز سے کہتی ہے انور کے وطن کی سر زمین
میری دھرتی کا جیلا آسماں بن کر اٹھا
بول اٹھے سب لوگ، جب دیکھا جنازے کا ہجوم
ایک قطرہ تھا جو بحر بیکراں بن کر اٹھا
تیسری تھی جنوری کی بدھ کا دن تھا ذوالفقار
جب جنازہ گھر سے انکی عز و شاں بن کر اٹھا

ذوالفقار جلالپوری

محلہ کریم پور، پوسٹ نگپور، جلالپور، امبیڈکر نگر
موبائل: 9415751528

قطعات

حضرت انور فقط ناظم نہ تھے
شعر گوئی میں بھی رکھتے تھے کمال
حمد و نعت و منقبت، نظم و غزل
اُن کی تخلیقات سب ہیں لا زوال

•

خوش ہوں یا غمگین ہوں ہر حال میں
زندگی بھر شکرِ رب کرتے رہے
دارِ فانی میں رہے جس وقت تک
خدمتِ اردو ادب کرتے رہے

•

جہد و عمل کا پیکر انور جلال پوری
شعر و ادب کا محور انور جلال پوری
مختور معترف ہیں سب اُن کی عظمتوں کے
دانشور و سخنور انور جلال پوری

ڈاکٹر مختور کا کوری

۶۸۔ چودھری محلہ، کاکوری، بکھنؤ
موبائل: 9450097929

غزل

چکے سے نام لے کے تھہرا بھی کبھی
دل ڈوبنے لگا تو ابھرا بھی کبھی
ہر چہرہ اٹک پاس جب اٹکے تو پی گئے
چمکا فلک پہ ایک ستارہ بھی کبھی
میں تو بھوت سی لیے اس دل کو کیا کروں
بے اختیار تم کو پکارا بھی کبھی
زہرِ الم کی اور بڑھانے کو تکیاں
بے مہریاں کے ساتھ دھارا بھی کبھی
رسوائیوں سے دور نہیں بے قراریاں
دل کو ہو کاش میر کا پارا بھی کبھی
قہرہ کی ایک مونچہ یہ کہتی نکل گئی
ساحل سے مصلحت ہے کنارہ بھی کبھی
اے شاہد جمال کوئی شکل ہے کی ہو
تیری نظر سے تیرا نگارہ بھی کبھی
ہنگام گریہ آہ سے ناداں اتر حذر
اڑتا ہے اٹک جیسے شرارہ بھی کبھی

غزل

مہنگی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی
بدلی کی چھایں تھی اور آئی اور گئی
مشغلہ بہار مجھ مگل کتر گئی
منہ بند جو کلی تھی کلی اور سنور گئی
پیشِ جمال یار کرنِ آفتاب کی
شرما کے چاہتی تھی کہ پلے بکھر گئی
مل کے بھجوت پھرے پیاروں کی چھاؤں کا
دھونی رمائے در پہ یہ کس کے سر گئی
کیا جانے آنکھ مار کے کیا کہہ گئی شوق
پھولوں کی گودِ موند نیم آ کے بھر گئی
سینے میں اور تاب دے شعلے کو شوق کے
سجدہ غلا آکر نہ جلی کھر گئی
تیری ہی جلوہ زار ہے دنیاے رنگ و بو
اے دوائے وہ نظر جو تجاہات پہ گئی
اب ہاتھ ملتے ہیں کہ دم عرضِ ماجرا
کہنے کی بات دھیان سے کیے اتر گئی
کچھ دن کی اور کھٹک زیت ہے اتر
ابھی بری گزرتی تھی جیسی گزر گئی



آزاد گھوڑی
۱۸۸۵ء
۱۹۶۷ء

غزل

دل گیا بے قراریاں نہ گئیں
مشق کی خاکاریاں نہ گئیں
مرئے نام پر وفا کے ہم
تیری بے اعتباریاں نہ گئیں
لب پہ آیا نہ اس کا نام بھی
غم کی پرہیز گاریاں نہ گئیں
کھپ گئی جان مجھ گئے تیر
اٹک کی تاجداریاں نہ گئیں
توبہ کرنے کو ہم نے کی تو تکر
توبہ کی شرمساریاں نہ گئیں
جان آ ہی گئی لیوں مگر
شوق کی پردہ داریاں نہ گئیں
وہ ہے کہیہ کہ سرد مہری ہے
اپنی جانب سے یاریاں نہ گئیں
گریہ بھی ہے اتر کا مستانہ
نہ گئیں بادہ خاریاں نہ گئیں

یہ سوچتے ہی رہے اور بہار ختم ہوئی
کہاں چمن میں نشیمن بنے کہاں نہ بنے



آزاد گھوڑی نے جب ہوش سنبھالا تو گھوڑی کی تہذیب اور تمدن پر زوال آچکا تھا۔ ان کا بچپن اس گھوڑی میں گزرا جس نے نوائین ادھ کی شان و شوکت کو لئے ہوئے دیکھا تھا۔ گھوڑی کی مٹان حکومت اب فرنگیوں کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ ان کی جدید مغربی تہذیب گھوڑی میں جڑ بٹانے کے حق کر رہی تھی۔ آزاد گھوڑی پر بھی اس کا زبردست اثر ہوا اور وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ٹیٹنگلک ہوئے۔ انکی اہم سرکاری مہموں پر قاعدہ ہے اور کچھ عرصہ ریاست جموں کشمیر میں بھی بطور سربراہ اپنی خدمات انجام دیں۔ حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں پدم بھوشن سے بھی نوازا۔ روزانہ کی سرکاری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادب سے ان کا تعلق قائم رہا اور انہوں نے روایتی مزاج کی مشقیہ شاعری جاری رکھی۔ مزین گھوڑی ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے ادبی موضوعات پر مضامین بھی تحریر کئے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'نیمان تین' کے نام سے شائع ہوا۔ میر انیس اور مرزا غالب پر ان کی تحریر کردہ کتابیں بھی نامی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا اصل نام مرزا جعفر علی خاں تھا، آخر قصص رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی ایسے مشہور مرتبے بھی لکھے جو ابھی بھی گھوڑی کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ گھوڑی کے شاعرانہ ماحول اور مزاج والی تہذیب کی فرانہ کی کرنے والے شعراء میں آزاد گھوڑی کا اہم نام ہے۔ آزاد گھوڑی کے اشعار خاص گھوڑی مشقیہ مزاج کے تصور کے جاتے ہیں۔ آزاد گھوڑی کے ۱۳۳۳ء میں یوم ولادت کے موقع پر ادارہ نیا دور کی جانب سے پیش ہے ان کی تین غزلیں۔

انور جلالپوری کے منتخب اشعار

اے منصف دوراں بتا ہم کس سے مانگیں خوں بہا مقتل ترا، مشہد ترا، قاتل ترے، خنجر ترا	راز یہ کھلتا نہیں کیسے گلستاں جل گیا دیکھنے میں تو کہیں کوئی بھی چنگاری نہ تھی	ختم ہونے ہی نہ پائے چاہتوں کا سلسلہ پھول میں رنگت کلی میں تازگی جب تک رہے
دل بھی کیا عجب شے ہے کیسی اسکی فطرت ہے دیر تک سلگتا ہے پر دھواں نہیں کرتا	مری جدائی ترے دل کی آزمائش ہے اس آئینے کو کبھی شرمسار مت کرنا	مرے مالک مجھے آسانیوں نے کر دیا بزدل مرے رستے میں اب ہر گام پر اک مرحلہ رکھنا
امیر شہر اسی غم میں رات سو نہ سکا غریب شہر کے تن پر ابھی ردا کیوں ہے	کون سی بستی میں یارب تو نے پیدا کر دیا دشمنی پر سب ہیں آمادہ خفا کوئی نہیں	اہل دل اس کو دل سمجھتے ہیں یہ ہے ہندوستان کی دلی
وہ بادشاہ بھی سانسوں کی جنگ ہار گئے جو اپنے گرد ہمیشہ سپاہ رکھتے تھے	بیٹھے ہوئے ہیں ڈھیر پہ بارود کے مگر پر امن زندگی کی دعا چاہتے ہیں لوگ	میں اتنی تیز اپنی منزلوں کی سمت دوڑا ہوں کہ مجھ کو وقت سے پہلے تھکن معلوم ہوتی ہے
شہروں کے شور و غل نے یہ سمجھا دیا ہمیں کتنا سکون گاؤں کے کچے گھروں میں تھا	یہ لیلیٰ سہانی چاندنی اک خواب ہے پیارے کہ جب سورج نکلتا ہے تو سنے ٹوٹ جاتے ہیں	وہ جس کو پڑھتا نہیں کوئی بولتے سب ہیں جناب میر بھی کیسی زبان چھوڑ گئے
سنگ ان ہاتھوں میں دیکھا جنہیں سمجھا میں نے یہ تو اپنے ہیں بھلا اپنوں سے خطرہ کیا ہے	ہر ایک شے کی بڑی دیکھ بھال کرتے ہیں جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں	میرے حالات پہ تم رشک تو کرتے ہو مگر تم نے دیکھا ہی نہیں ہے مرا محنت کرنا
ہر کوئی منظر یہاں اک عارضی تصویر ہے خواب کوئی اپنی آنکھوں میں سجائیں کس لئے	شہرت کو سیاست کی کثافت سے بچالے عزت مجھے مغرور نہ ہونے کے لئے دے	روح کی پاکیزگی دل کا سکون اس دور میں چھین کر ہر اک سے ذہن تاجرانہ لے گیا
رفقار میں لچک ہے تو گفتار میں مہک یارب یہ لوگ کون سی دنیا سے آئے ہیں	میں نے ہر عہد کی لفظوں سے بنائی تصویر کبھی خسرو، کبھی خیام، کبھی میر ہوں میں	تنقید مجھ پہ کی تو میرے دوستوں نے کی حد درجہ رکھ رکھاؤ مرے دشمنوں میں تھا
مقتل کے اداکار یہی لوگ ہیں جن کے نازک ہیں بدن ہاتھ میں خنجر بھی نہیں ہے	دل کسی کا ہو مقدس ہے حرم کی مانند اس عمارت کو گرانے کی سزا پاؤ گے	موسم کے ساتھ سارے مناظر بدل گئے لیکن یہ دل کا زخم ہرا تھا ہرا رہا
کوئی پوچھے گا جس دن واقعی یہ زندگی کیا ہے زمین سے ایک مٹھی خاک لے کر ہم اڑا دیں گے	کہہ گیا کوئی سر دار و رسن تیری خاطر جو ہوا اچھا ہوا	سچائیوں کی جیت یقین تھی دوستوں بازی مگر لگانی پڑی اس میں جان کی

تو میرے پاس تھا یا تیری پرانی یادیں
کوئی ایک شعر بھی تنہا نہیں لکھا میں نے

تم پیار کی سوغات لئے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا

دشمنی اور دوستی پہلے بھی ہوتی تھی مگر
اس قدر ماحول کا ماحول زہریلا نہ تھا

سوتے ہیں بہت چین سہ جگے گھروں میں
مٹی کے علاوہ کوئی برتن نہ ملے گا

کچھ دنوں سے اک عجب معمول ان آنکھوں کا ہے
کوئی آئے یا نہ آئے پھر بھی رستہ دیکھنا

ہم مسافر ہیں ہمیں رکے ٹھہرنے کے لئے
آپ کے گھر میں نہیں دل میں ٹھکانا چاہئے

مری خواہش کا کوئی گھر خدا معلوم کب ہوگا
ابھی تو ذہن کے پردے پہ بس نقشہ بنانا ہوں

میں جنگ بار کے بھی معتبر سپاہی ہوں
مری نیام میں شمشیر جو ہے میری ہے

جو مجھ سے دشمنی کھل کر نبھائے
مجھے وہ آدمی اچھا لگے ہے

جو مذہب اوڑھ کر بازار نکلیں
ہمیشہ ان اداکاروں سے بچنا

تمہیں آئیں گی نادر شاہ پر
آپ دلی روز ہی لوٹا کریں

کوئی موسم ہو کوئی بھی سماں اچھا نہیں لگتا
تمہارے بعد اپنا ہی مکاں اچھا نہیں لگتا

خواب ٹوٹے جاتے ہیں، دل شکست کھاتا ہے
بے سبب کوئی پاگل دیر تک نہیں رہتا

آج میں نے اپنے غم کا اس سے شکوہ کر دیا
ایک لغزش زندگی بھر کی عبادت کھا گئی

اس ناامید شخص نے یوں کی ہے خودکشی
ناخن کی تیز دھار کو خنجر بنا لیا

خفا تو دونوں ہی ایک دوسرے سے تھے لیکن
ندامت اس کو بھی تھی شرمسار میں بھی تھا

ابھی آنکھوں کی شمعیں جل رہی ہیں پیار زندہ ہے
ابھی مایوس مت ہونا ابھی بیمار زندہ ہے

غلط کاموں کا اب ماحول عادی ہو گیا شاید
کسی بھی واقعہ پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا

اے دوست ہر قدم پہ مناظر اجل کے دیکھ
اک روز میرے ساتھ سفر پر نکل کے دیکھ

اب کے موسم میں مرے چاہنے والوں کی قسم
اتنا پتھر مرے سر پر کبھی برسا ہی نہیں

دل جلا دو کہ تیرگی مٹ جائے
ان ستاروں میں روشنی کم ہے

جل کے گھر خاک ہوئے ہو گئی مدت لیکن
آج بھی شمع جلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

نیم ہمارے گھر کی شوبھا، جامن سے بچپن کا رشتہ
ہم کیا جانیں کس رنگت کا ہوتا ہے بادام کا پیڑ

ہونہ ہوشعلوں کی زد میں آ گیا پھر کوئی گھر
میری آنکھوں میں یہ چنگاری کہاں سے آ گئی

چاندنی میں رات بھر سارا جہاں اچھا لگا
دھوپ جب پھیلی تو اپنا ہی مکاں اچھا لگا

جہاں ہے پیار وہیں رنجشیں بھی دیکھو گے
جہاں غرض ہے وہاں دوستی زیادہ ہے

سبھی کے اپنے مسائل سبھی کی اپنی انا
پکاروں کس کو جو دے ساتھ عمر بھر میرا

بات کا زخم عجب زخم ہے جس کا انور
درد گھٹ جائے مگر زخم تو بھرتا ہی نہیں

جو دعائیں دے رہے تھے وہ مخالف ہو گئے
میری شہرت میرے یاروں کو بڑی مہنگی پڑی

گاؤں چھوڑا شہر پہنچے بھول بیٹھے بولیاں
اب بڑے شہروں میں لوگوں کی زباں کوئی نہیں

بکریہ Rays of Thought ہر فرزانہ

□□□

عطا ہوئی ہے مجھے دن کے ساتھ شب بھی مگر
چراغ شب میں جلا دیتا ہے ہنر میرا

تو مجھے پا کے بھی ناخوش تھا یہ قسمت تیری
میں تجھے کھو کے بھی خوش ہوں یہ جگر میرا ہے



انس مسرور انصاری
سکراول، اردو بازار، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر
موبائل: 9453347784

کتاب دل کے ورق سے

تمہاری یاد میں ہے ا شکبار چشم وطن
یقین جانو، تمہیں ہم بھلا سکیں گے کب
جدا ہوئے ہو تو سب کو رلا گئے ہو تم
خلوص و پیار و محبت کی یاد آتی ہے
ہمارے سر پہ شفیق آسمان تھے گویا
ہمارے باغ دل و جاں میں پھول کھلتے تھے
خزاں کو غازہ دوشیزہ بہار کیا
کہ خار و خس کو بھی خوشبو کا رشتہ دار کیا
تو شہرتوں نے بھی جھک کر تمہیں سلام کیا
کہ سب کا ایک ہے خالق، بتا دیا تم نے
کیا جو تم نے وہی کام چاہتی ہے آج
فسوں طرازی تعصب کی توڑ دیتا ہے
سخنوروں کی زمیں تم پہ ناز کرتی ہے
خزاں کے دوش پہ آئینہ بہار تھے تم
تمہارے جذبہ انسانیت کو لاکھوں سلام
حدود و ہم و گماں سے گزر گئے انور
ہمارے جذبہ سوز دروں میں زندہ ہو
زمیں کے نیچے اگرچہ سلا گئی دنیا
دلوں میں روح ہے اب بھی غزل سرا انور
حدود وقت سے آگے گزر نہیں سکتے
ابھی تو زندہ رہو گے کئی زمانوں میں
غزل کی طرح شگفتہ، کنول کی طرح سہل
ہمارے پاس ہو تم دوریوں کے غم نہ کرو
تمہاری قبر پہ رحمت کی بارشیں ہوں سدا

امیر شہر سخن، جان رنگ و بوئے چمن
سفیر امن و سکون، رہنمائے شعر و ادب
حدیث دیدہ دل یوں سنا گئے ہو تم
تمہارے علم و فضیلت کی یاد آتی ہے
سلگتی ریت پہ اک سائبان تھے گویا
جو زندگی کے کسی موڑ پر بھی ملتے تھے
حقیقتوں کو زما نے پہ آشکار کیا
وطن سے ٹوٹ کے تم نے کچھ ایسے پیار کیا
فروع اردو زباں کا جو تم نے کام کیا
دکھا یا گیتا و قرآن کا آئینہ تم نے
تمہارے کام کو دنیا سراہتی ہے آج
یہ کام وہ ہے دلوں کو جو جوڑ دیتا ہے
پیہروں کی زمیں تم پہ ناز کرتی ہے
وطن کو فخر ہے تم پر کہ جاں نثار تھے تم
قیام امن و امن کی کوششیں تمہیں مدام
اڑائی کس نے یہ افواہ مر گئے انور
اسے خبر ہی نہیں ہے جو ایسا کہتا ہو
تمہارے جسم کو دفنا کے آگئی دنیا
تمہارا جسم نہیں ہے تو کیا ہوا انور
مجھے یقین ہے انور کہ مر نہیں سکتے
تمہارے لفظ و بیاں گونجتے ہیں کانوں میں
تمہاری یاد کی خوشبو تمہارا حسن عمل
کتاب دل کے ورق آنسوؤں سے غم نہ کرو
خدائے پاک سے کرتے ہیں مغفرت کی دعا

تمہارے قرب کی لذت کو دل میں پاتے ہیں
کوئی دن اور کہ ہم تم سے ملنے آتے ہیں

تعلیم و تربیت اطفال



مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ء ۱۹۸۹ء

والد مرحوم کا طرز تربیت بالکل مختلف انداز کا تھا۔ وہ طویل گفتگو یوں بھی نہیں فرماتے تھے۔ دوستوں کے مجمع میں یا مقررین کی صحبت میں بھی خود بہت کم بات کرتے تھے۔ زیادہ تر دوسروں کو مخاطب کر کے باہم دگر سوال و جواب پر آمادہ کر دیتے تھے اور خود مسکرا مسکرا کر دوسروں کی باتیں سنا کرتے تھے۔ وہ کسی قدر مغلوب الغضب بھی تھے لیکن جب غصہ آ جاتا تو دو کلمے زور سے کہہ کر یک لخت سکوت اختیار کر لیتے۔ میرے ساتھ زندگی بھر یہ طرز عمل رہا کہ کوئی بات خلاف مزاج ہوتی تو ایک خشن آواز میں 'ہوں' کہہ کر گہری سانس لیتے اور خاموش ہو جاتے تھے۔ میرے عہد طفولیت میں جب کھلائی ان کے حضور بٹھا کر ہٹ جاتی تو وہ یہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ دیر تک ان کی آنکھوں سے سامنے بیٹھا رہوں۔ میری تسلی کے لئے کبھی کوئی تصویر مرحمت فرماتے، کبھی کوئی کھلونا عنایت کرتے اور کبھی تو وہ خود بچوں کی طرح میرے ساتھ کھیلنے لگتے تھے۔ مردانہ نشست گاہ میں میرے دوران قیام وہ میرے اوپر سر سے پاؤں تک نگاہ رکھتے تھے۔ پوشاک یا اعضاء و جوارح کی صفائی میں کوئی نقص ہوتا تو ملازمہ کے بجائے مجھ پر اعتراض وارد کرتے تھے لیکن اس اعتراض میں الفت و رافت جھلکتی تھی۔ مجھے دوسروں سے بات کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتے تھے اور دوسروں سے یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ مجھ سے گفتگو کریں۔ اس بات چیت میں کبھی زبان و بیان میں اعتراض ہوتا تو کبھی واقعات کو صحت کے ساتھ پیش

نہ روم، نہ تھینس، نہ قطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دل فریب ہوگا جتنا یہ شہر ۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوائین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیات حاصل ہوئی، اتنی شان و شوکت دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔ پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نہرو آتما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

داس کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطہ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی چودھویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین کی کتاب 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'** سے ایک تحریر **تعلیم و تربیت اطفال، حصہ دوم** حاضر ہے۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

کرنے کا طرز سیکھا تھا۔ ان نشستوں میں ان کے خدمت گار اور مخصوص ملازمین وقتاً فوقتاً حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا حکم دے دیتے تھے کہ ملازم کو مجھ سے یا مجھے ملازم سے بات کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی تھی۔ نوکر کو مخاطب کرنے میں میرے لئے 'آپ' کہنا ضروری تھا۔ محل کے اندر بعض کنیزوں سے تم کہہ کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اگر بھولے سے کبھی کسی ملازم کو ان کے حضور تم کہتا تو وہ خفا ہو جاتے اور مجھے اس ملازم سے معذرت کرنا پڑتی تھی۔ میری معذرت خواہی پر وہ خوش ہو جاتے اور بڑی شفقت سے یہ فرماتے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ بچوں کو ڈانٹنے اور ان پر خفا ہونے کو وہ بہت برا سمجھتے تھے۔ کسی دوسرے کے بچے کی باہر سے رونے کی آواز آ جاتی تو بے قرار ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی گھبرا کے خود ہی نشست گاہ سے باہر آ کر رلانے والے پر برہم ہو جاتے تھے۔ بچہ کو مار دینا ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا لیکن تمام عمر میں انہوں نے مجھے میرے عہد طفولیت میں صرف ایک بار ایک تھپڑ مار دیا تھا اور یہ واقعہ مجھے تاحیات یاد رہے گا۔ اس واقعہ کو پیش کرنے کے قبل یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ والد مرحوم نے بہت طویل عمر پا کر ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا تھا۔ اس وقت میری عمر اڑتیس برس کی تھی لیکن اس ایک واقعہ کے علاوہ میری کسی انتہائی خلاف مزاج حرکت پر بھی جو بکثرت سرزد ہوتی تھیں، انہوں نے کبھی کسی شدید برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ غیر معمولی کٹر قسم کے مذہبی انسان تھے اور میں انگریزی

تعلیم حاصل کر کے ان کے نزدیک لامذہب اور بے دین ہو چکا تھا۔ اس صورت حال سے ان کو میری ذات سے بہت صدمہ رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں کے کسی مخالف نے ان کو روحانی ایذا پہنچانے کے لئے یہ خبر سنا دی کہ میں نے مئے نوشی اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے اس شخص کو یہ جواب دیا کہ میں بالغ و عاقل تھا لہذا اپنے افعال کا خدا کو خود جواب دہ تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق تھا وہ امور شرعیہ کی تعلیم دلوا کر بری الذمہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس شخص کو یہ جواب تو دے دیا تھا لیکن وہ خبر ان کے دل و دماغ میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتی تھی۔ کچھ مدت کے بعد انہوں نے یکا یک مجھ سے باز پرس کر ڈالی اور خبر کی صحت و عدم صحت کے بارے میں براہ راست سوال کر لیا۔ میں اسی سال وکالت کے پیشہ میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ قبلہ! یہ سوال آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ اگر میں شراب پیتا ہوں اور جواب اثبات میں دیتا ہوں تو آپ کو سخت صدمہ ہوگا اور اگر نہیں کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے کے گناہ کی سزا کا مستوجب ہوں گا۔

انہوں نے میرے اس جواب پر 'ہوں' کہہ کر بہت گہری سانس لی اور خاموش ہو گئے۔ ان کے ایک حاضر الوقت دوست نے جن کو میں چچا کہتا تھا، خنگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بدتہذیب قرار دیا۔ میں نے مؤدبانہ جواب دیا کہ جھوٹ بولنے کے مقابلہ بدرجہا بدتہذیبی بہتر ہے اور جھوٹ بولنے سے اجتناب جناب محترم کی تعلیم ہی کا اثر ہے۔ ان کو زیر نظر واقعہ نہیں معلوم تھا لیکن میرے پیشرو ہی تھپڑ تھا جو زندگی میں ایک بار ان کے ہاتھوں مجھ پر پڑا تھا۔

یہ واقعہ اس زمانہ سے متعلق تھا جب میں عربی مدرسہ کا طالب علم تھا اور میری عمر آٹھ برس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ والد مرحوم کو بہترین قلم سے لکھنے کا ذوق تھا اور وہ اپنے قلم بڑی محنت و کاوش سے خریدتے تھے۔ اس زمانہ میں ان قلموں کو 'کلک' کہتے تھے اور بہترین کلک کی

چوک میں زیادہ سے زیادہ دکانیں لگتی تھیں۔ یہ کلک گراں بھی ہوتے تھے یعنی یہ کہ ایک ایک قلم کئی پیسے کا ہوتا تھا۔ کلک بہت مضبوط، خوش رنگ اور خوشبودار ہوتا تھا۔ بنانے والے بڑی محنت سے بناتے تھے۔ والد مرحوم کو یہ قلم اتنے عزیز ہوتے تھے کہ وہ کسی کو چھونے تک نہیں دیتے تھے۔ میں نے کسی کی جہالت میں ان کے قلم ان سے ایک قلم بغیر ان کی اجازت اور اطلاع



سے نکال لیا اور برابر اسی سے لکھنے لگا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک روز ان کی نظر پڑ گئی۔ والدہ مرحومہ کی طرح وہ بھی خبر گیری کے لئے ہمارے کمرے میں کبھی کبھی آ جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے کلک سے لکھتے ہوئے دیکھا اور بے تابانہ قریب آ کر دریافت کیا کہ یہ قلم کہاں سے لائے۔ مجھے قطعاً نہیں معلوم تھا کہ کلک کیا ہے۔

میں نے برجستہ جواب دیا کہ اسکول سے واپسی پر خریدا تھا۔ انہوں نے غصہ ضبط کر کے دوسرا سوال کیا کہ کہاں سے خریدا؟ میں نے ایک فرضی دکاندار کا نام بھی بتا دیا۔ اب انہوں نے تیسرا سوال کیا کتنے کو خریدا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ وہ قلم قیمتی ہوتا تھا اس لئے برجستہ کہہ دیا کہ ایک پیسہ کو۔ اب ان کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے ایک تھپڑ مارا اور فرمایا کہ 'چوری کرتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے'۔ گھر میں یہ واقعہ ایک سانحہ عظیم کی حیثیت رکھتا تھا۔ والدہ مرحومہ بہت روئیں، میری انا نے کئی وقت کھانا نہیں کھایا، والد مرحوم کے حضور ایک مدت تک نہ میں گیا اور نہ وہ خود میرے کمرے میں آئے۔ جہاں تک میرے تاثرات کا خیال ہے آج تک میں جھوٹ بولنے کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور وکالت کے پیشہ میں داخل ہونے کے بعد بھی حتی المقدور اس گناہ سے احتراز کرتا رہا تھا۔

اس گراف قدر تربیت کے ساتھ ساتھ دستور زمانہ کے مطابق لڑکیوں اور لڑکوں کو پڑھوایا بھی جاتا تھا۔ لڑکیاں محل میں متعین مستقل استانی کے سپرد کر دی جاتی تھیں جو ان کو بڑی محنت و جانفشانی سے پڑھاتی تھیں اور لڑکیاں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتی تھیں لیکن لڑکوں کی پڑھائی میں بڑی ست رفتاری ہوتی تھی۔ مدرسوں یا مکتبوں میں لڑکوں کو بھیجنا ناپسند تھا۔ محل کا تمام بیرونی ماحول رئیسانہ اور شاہانہ ہوتا تھا۔ پڑھانے والے بھی آرام طلبی میں وقت ضائع کرتے تھے۔ ان حالات میں لڑکوں کی بہت اچھی تعلیم ممکن ہی نہیں تھی حالانکہ بسم اللہ کی رسم ادا ہونے کے قبل ہی سے ایک مولوی اور ایک مدرس ملازم رکھ لئے جاتے تھے۔ مولوی دوسرے ہی دن سے بغدادی قاعدہ پڑھانا شروع کر دیتا تھا۔ بغدادی قاعدہ اس لئے پہلے پڑھایا جاتا تھا کہ بچہ عربی حروف و الفاظ سے مانوس ہو کر قرآن مجید پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اردو پڑھانے کا سلسلہ بھی اسی وقت شروع ہوتا تھا جس پر مولوی سے زیادہ گھر کی استانی توجہ کرتی تھی۔

اردو پر گھر کے ماحول کی بدولت مہارت ہو جاتی تھی۔ سلیس زبان بولنا اور اردو کے محاورات پر قابو پانا تربیت ہی کی برکتوں سے آجاتا تھا۔ بیگمات سے بہتر کوئی مولوی یا مدرس اردو پر قادر نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے بچوں کو یہ دولت بغیر کسی زحمت کے مل جاتی تھی۔ مدرس آمدنامہ اور خالق باری پڑھانے پر پہلے توجہ کرتا تھا۔ اس کے بعد گلزار دبستان اور گلستاں پھر بوستاں پڑھاتا تھا۔ اسی تعلیم میں برسوں صرف ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف مولوی صاحب قرآن مجید کے کچھ پارے اور دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد صرف میر پھر نحو میر پڑھاتے تھے۔ صرف و نحو کی اس ابتدائی تعلیم کے بعد پنج گنج بھی کسی نہ کسی طرح رٹا کے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا تھا۔ یہ بھی مشہور ہو جاتا تھا کہ قرآن ختم کر دیا گیا اور اس ختم قرآن کی خوشی میں دعوتیں ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ لڑکا چودہ پندرہ برس کی عمر تک صرف اتنی ہی تعلیم پا کر فارغ التحصیل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد نو جوان جو کچھ علم حاصل کرتے یا فنون میں کمال دکھاتے وہ صرف اپنے ہی ذوق و شوق یا والدین کے رغبت دلانے کا نتیجہ ہوتا تھا۔ ایسے طالبان علم میں بھی بڑے بڑے ذی وقار موجود تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک صف اول کے رؤسا میں نواب آغا ابو صاحب مرحوم کی ذات گرامی فتنہ اور اصول میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

درسیات کی اس نامکمل اور ناقص تعلیم کے باوصف دو علوم ایسے تھے جن کی طرف رؤسا و عمائدین کو بڑی رغبت تھی جن میں ایک علم طب اور دوسرا علم عروض تھا۔ معاشرہ شعر و ادب میں سرشار تھا۔ ہر رئیس اپنے کو با کمال شاعر سمجھتا تھا اور اپنے اس مفروضہ کمال کو ثابت کرنے کے بعض رئیسوں کو ضرورت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہر رئیس کے دربار سے دو اور بعض کے یہاں زیادہ شعراء متعلق رہتے تھے۔ انہیں شعراء کی بدولت کسی کو کم اور کسی کو زیادہ عروض سے واقفیت حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ کی اور پیشی اپنے اپنے شوق پر منحصر ہوتی تھی۔ اس لئے

رؤسا کو عروض میں واقفیت حاصل کرنے کے لئے زحمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جب ذاتی شوق کو آسودگی فراہم کرنے کا سوال آجائے تو زحمت بھی آسان ہو جاتی تھی۔ اسی طرح علم طب سے بھی بڑا ذوق تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ علم طب کا کسی نہ کسی حد تک حاصل کرنا اس زمانے کے فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ بعض اطباء یقیناً اچھے شاعر بھی تھے لیکن ہر شاعر علم طب میں بھی کچھ نہ کچھ دخل رکھتا تھا۔ شرفاء عام طور سے طبابت کا پیشہ پسند کرتے تھے اور رؤسا طب کو برائے طب حاصل کرتے تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خانوادہ خان علامہ کی



ہر فرد جو بالغ و فرزانہ تھی علم طب سے باخبر تھی اور طبابت نہ کرنے پر بھی اپنے نام کے پہلے لفظ حکیم کا استعمال اپنے لئے باعث مفاخرت سمجھتی تھی۔ اس علم کے حصول سے بہر حال اتنا فائدہ ضرور تھا کہ اپنے محل کے معالجات میں رؤسا کو دلچسپی رہتی تھی اور اپنے خاندانی طبیب سے عند الضرورت تبادلہ خیالات کر لیتے تھے جس کے نتائج سودمند ہی ہوتے تھے۔

ان علوم کے علاوہ بعض فنون میں بھی رؤسا کو دلچسپی تھی۔ ان کو بڑے ذوق و شوق سے سیکھتے اور

ماہرین کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ موسیقی کا ذوق سب کو تھا اور کسی نہ کسی طرح اس فن کی نزاکتوں میں کچھ نہ کچھ درک بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن عملاً موسیقی میں درس کبھی کسی رئیس نے نہیں لیا۔ راقم کے مورث اعلیٰ رات بھر کتب بینی کرتے یا تصنیف و تالیف میں شب بیداری فرماتے تھے۔ بعد نماز صبح بھیرویں سن کر آرام فرماتے تھے لیکن باوجود راگ اور راگینوں پر پوری علمی واقفیت کے خان علامہ نے کبھی خود کوئی مشق نہیں کی۔ خطاطی کے فن میں ان کے اخلاف نے بڑے بڑے صاحب کمال استادوں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ خان علامہ خود بھی خط نسخ و نستعلیق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سعادت علی خاں نے یہ فن انہیں سے سیکھا تھا۔ خطاطی کا شوق بہت سے رؤسا کو تھا اور بیسویں صدی کے اوائل تک متعدد بزرگ اس فن کے ماہر تھے۔ مصوری کا ذوق بھی ہر رئیس کو تھا لیکن عملاً یہ شوق دو چار بزرگوں ہی کو ہوا۔ ان فنون کے علاوہ فنون کی طرف بھی بعض رئیسوں کی توجہ ہوئی تھی اور انہوں نے با کمال فنکاروں کی شاگردی قبول فرمائی تھی۔ بہر حال یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ علوم و فنون سے ہمارے رؤسا کو شغف تھا لیکن یہ ذوق انفرادی طور پر سن شعور آ جانے کے بعد پورا کیا جاتا تھا۔ ان فنون کے سیکھنے میں بزرگوں کی ہدایت یا سرپرستی کو بہت کم دخل ہوتا تھا اور نہ ایسا ہوتا تھا کہ کوئی رئیس اپنے بزرگوں کی ایسے ذوق و شوق میں تقلید یا تاسی کرے۔ اس صورت حال سے یہ نتیجہ پورے ذوق کے ساتھ نکالا جاسکتا ہے کہ مفروضہ طور پر فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہر رئیس کا رجحان اپنے ذاتی ماحول کے تحت کسی نہ کسی علم یا فن کی طرف مبذول ہو جاتا تھا۔ صرف علم طب اور علم عروض ہی کی مقبولیت میں ہمہ گیری تھی اور فنون میں خطاطی کو بڑے طبقہ میں شرف قبول حاصل تھا۔

□□□

اس کے سورج چاند ستارے



جھما شرما

17B1، ہندوستان ٹانکس پارکمنٹ، میروہار،

نیر-1، دہلی موبائل: 9818258822

اس کی ننھی انگلیاں ٹیمپلیٹ پر کسی مشاق رقاصہ کی طرح تھرکتے ہوئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی تھیں۔ کبھی پہلی انگلی آگے نکل جاتی تھی تو کبھی دوسری انگلی اسے پچھاڑ دیتی ہے۔

انہیں انگلیوں کے سہارے تو اس نے چاند اور تاروں کو اپنی الماری، فرج اور صوفے پر چپکا دیا تھا۔ یہ چاند ستارے اس کی بوائے منگائے تھے۔ وہ انہیں کتاب سے پھاڑ کر جگہ جگہ چپکا دیتا تھا۔ رات میں دادا جی جب اٹھے تو لگا جیسے کمرے میں روشنی ہے۔ لائٹ تو بند تھی مگر کمرے کی الماری پر چپکائے اس کے ستارے روشنی بکھیر رہے تھے۔ وہ اندھیری رات میں چمکتے تھے۔ ان کے پیچھے پوشیدہ اس کا چہرہ اور ٹٹماتی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ چاند ستاروں کو ٹٹماتے مبینوں گزر گئے۔ اسے گئے بھی کتنے دن ہو گئے لیکن لگتا ہی نہیں کہ وہ جا چکا ہے۔ اب بھی اس کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ لگتا ہے، بس یہیں، یہیں کہیں!

’آر یو منگ می بوا؟‘ اپنے گھر پہنچنے کے بعد اس نے اسکاپ پر پوچھا تھا۔

بوا نے اس کی اداسی دور کرنے کے لئے بہانے کو کہہ دیا ’ہاں! میں تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ ابھی میں پودوں کو پانی دے رہی تھی تو بہت یاد آئے۔ یاد ہے، ہم دونوں مل کر پودوں کو پانی دیتے تھے۔ تو پودوں کی پتیوں کو چھوتا تھا، پھول توڑنے کی کوشش کرتا تھا، میں منع کرتی تھی۔ ایک دن تو نے گلاب توڑ کر ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا اور تو کتنی زور سے ہنسا

تھا۔ تیری چالاکی پکڑی گئی تھی نا، شیطان کہیں کا۔ وہی پودے اب تجھے بہت یاد کر رہے ہیں۔ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا بے بی کب آئے گا؟ کیا اسے ہماری یاد نہیں آتی؟‘

’کیا تم نے انہیں بتا دیا کہ میں چلا گیا؟ رو رو ہے تھے میری یاد میں؟ مگر بوا! انہیں کیا بتایا، میری بات کرادوان سے۔‘ اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

جھما شرما ہندی زبان کی مشہور افسانہ نگار۔

افسانوں اور مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ بھارتیندر ہرچند راعی از سے سرفراز اور ہندی اکادمی، دہلی سے تین مرتبہ انعام سے سرفراز۔ ریڈیو اور ٹی وی چینلوں پر بچوں کے لئے اسکرپٹ رائٹنگ بھی کرتی ہیں۔ پیش ہے ان کی کہانی ’اس کے سورج چاند ستارے‘ جس کا اردو ترجمہ ’مناظر حسین‘ نے کیا ہے۔

اب کیا کرتی بوا؟ پودوں سے اس کی باتیں کیسے کرائے۔ اس نے اس کی بات ٹال کر کہا۔ ’ہر روز جب میں پانی دینے جاتی تھی تو تیرے بارے میں پوچھتے تھے، میں بہانا بنا دیتی تھی کہ یہیں ہے، جلد ہی ملنے آئے گا۔ ایک دن تو سب کے سب سسکیاں بھرنے لگے، کہنے لگے، بلاؤ، ابھی بلاؤ ہمارے بے بی کو۔ تب میں نے ان سے کہا تھا کہ سچی بات بتاؤں تو روئیں گے تو نہیں؟ انہوں نے وعدہ کیا کہ نہیں روئیں گے۔ تب میں نے انہیں بتا دیا کہ ہمارا بے بی تو بہت

دور چلا گیا۔ اب تو بہت دن بعد آئے گا۔ پودے روئیں گے تو آخر انہیں چپ کون کرائے گا۔ ان کے تو می پاپا بھی یہاں نہیں رہتے۔ پھر پتہ چل گیا کہ تم بھی چلے گئے تو ان کو کتنا دکھ ہوگا۔ اس لئے میں نے ان سے عہد لے لیا کہ وہ روئیں گے نہیں۔‘ بوا نے اسے سمجھایا۔

لیکن ان کے می پاپا کہاں چلے گئے؟ کس کے ساتھ رہتے ہیں، وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟ انہیں اپنے پودوں کی یاد نہیں آتی؟ میرے می پاپا تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈائنامو کی پونچھ مروڑتے ہوئے کہا۔ اب بوا کیا جواب دے؟ کیسے بتائے کہ پودوں کے می پاپا کہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی اس کے ہزاروں سوالوں میں کن کن سوالوں کا جواب دے سکتی ہے۔ کئی بار تو اس کے سوالوں کے جواب تو کسی کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ اس لئے ان سوالوں کو بھلانے کے لئے اسے کسی دوسری بات میں الجھا دیا جاتا ہے۔ وہ ادھر سے چلا رہا تھا، ’بتاؤ بوا، بتاتی کیوں نہیں؟‘ بوا بہت دیر چپ رہی اور پھر کچھ دیر بعد سوچ کر بولی:

’جیسے کہ دادا دادی تمہارے پاس نہیں رہتے یا تم دادا دادی کے پاس، ویسے ہی پودوں کے می پاپا ان کے پاس نہیں رہتے۔‘

’بٹ آئی کو مائی دادا جی اور دادی۔ میں تو روز

ان سے باتیں کرتا ہوں۔ کیا پودے بھی اپنے می پاپا سے روز اسکا سب پر باتیں کرتے ہیں، انہیں پیار کرتے ہیں۔ اس نے پوچھا۔

دو دن پہلے ہی تو اس نے یہاں ہوا کی سالگرہ منائی تھی۔ اسی خوشی میں پورے گھر میں دھما چوکڑی مچا رہا تھا۔ گانوں پر ڈانس کر رہا تھا۔ اس کے ڈانس کا دادی نے ویڈیو بنایا تھا۔ ہوانے اپنے یوم پیدائش کے لئے جو کیک آن لائن آرڈر کیا تھا اس پر اسی کا نام لکھوایا تھا جیسے اسی کا برتھ ڈے ہو۔ اسی نے کیک کاٹا تھا اور خود ہی دیر تک تالیاں بجاتا رہا تھا۔

حالانکہ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ اس سے کیک مت کٹوائیے۔ دوسرے بچوں کی سالگرہ میں شرکت پر وہاں بھی سمجھتا ہے کہ اسی کا برتھ ڈے ہے، اسے ہی کیک کاٹنا ہے۔ ایک دو بار تو جس بچے کی سالگرہ تھی اسے ہی کیک نہیں کاٹنے دیا۔ بغض ہو گیا کہ کیک یہی کاٹے گا۔ بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔

اس کے بعد دادی نے کہا تھا۔ ارے آج تو اسے ہی کاٹ لینے دو، دل ٹوٹ جائے گا بیچارے کا۔ بڑا ہونے پر سب سیکھ جائے گا۔ ابھی سے سب کچھ بڑوں کی طرح کرنے لگے گا تو بچے کس بات کا؟

لیکن اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ہر روز اپنا برتھ ڈے نہیں منا سکتا۔ اس کی ماں نے ناراضگی سے کہا۔

دیوار پر لگی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اس کی آواز پورے گھر میں سنائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف لٹکے ہوئے کپڑوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں بھی انہیں گھنٹیوں کی آواز پر اچھل کود میں مصروف تھیں۔ وہ کیک کاٹ رہا تھا اور گا بھی رہا تھا پپی برتھ ڈے ٹویو ڈیئر یو! دوڑ دوڑ کر سب کے منہ پہ کیک لگا رہا تھا۔ کوئی کھانے سے منع کرے تو ناراض ہو جائے۔ دادا دادی، ہوا، اس کے می پاپا سب اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

دادا دادی اور ہوا سب یہ نہیں سوچنا چاہتے تھے

کہ کل اس وقت تک وہ کہیں سے کہیں اڑ کر چلا گیا ہوگا۔ جس دن اسے آنا تھا، لگتا تھا کہ یہ رات جلدی کیوں نہیں کنتی اور آج ایسا لگ رہا تھا کہ یہ رات کبھی ختم ہی نہ ہو۔ وہ کبھی یہاں سے نہ جائے۔ وہ اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا، آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔

سویرے جب سورج کی کرنیں بھی نہیں پھوٹی تھیں، آسمان کی ہلکی سرخی اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ صبح ہونے کو ہے، تبھی وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ چلا گیا۔ کوئی اس کے سامنے نہیں رویا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی سے رونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ یہ بہت روتا ہے اور پھر بخار آ جاتا ہے۔ وہ بیمار نہ پڑ جائے اس لئے روائگی کے وقت دادی نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ کہیں وہ دیکھ نہ لے کہ دادی کی آنکھیں نم ہیں۔ ہوانے بھی منہ پھیر لیا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی بھی آنکھ ملتا ہوا اٹھا تھا۔ ہاتھ روم میں گیا تھا، برش کیا تھا، ناشتہ کیا، سب کو پیار کرتا ہوا سیر جیوں سے اتر اٹھا۔ پارک کی گھاس پر اب بھی اس کے پاؤں کی خوشبو موجود ہوگی۔ جن سڑکوں سے گزرا ہوگا وہاں بھی یادوں کی کچھ نہ کچھ علامت ضرور موجود ہوگی۔ انیر پورٹ جیسے اب بھی ننھے پاؤں کی آہٹ سے بھرا ہوگا اور کچھ ہی دیر میں دیکھتے دیکھتے وہ ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔

وہ چلا گیا ہے، احساس ہی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے، عقب کے کمرے میں نیند کے دوران کوئی خواب دیکھ رہا ہے یا اسی چاند کے ساتھ اڑا جا رہا ہے جسے وہ اپنے بیگ میں ٹیبلٹ کے ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔

دو دن سے وہ سوال در سوال پوچھ رہا تھا۔ آپ سب چلیں گے نا میرے ساتھ۔ آخر کوئی تو اسے یقین دلائے کہ سب اس کے ساتھ چلیں گے۔ پھر اس کے پاپا نے سمجھایا تھا کہ ساتھ تو نہیں چلیں گے لیکن بعد میں

ضرور آئیں گے۔

تب اس نے بھگے گلے سے پوچھا تھا، میری ہوا بھی؟

ہاں، ہوا بھی۔ اس کی ماں نے جواب دیا۔ لیکن اسے یقین نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے رو رہا تھا۔ کبھی سبزی میں مرچ کی زیادتی پر تو کبھی ٹیبلٹ میں گیم بدلنے پر۔ اس کی آنکھیں مسلسل نم تھیں۔

تو تو ہی رک جاناں یہاں؟ دادی نے اسے بہلانے کے لئے کہا تھا۔

مگر مجھے اسکول جانا ہے، وہاں میرے دوست ہیں۔ میرا گھر بھی میرے بغیر کتنا اداس ہوگا۔ مجھے سوئمنگ، ٹائیکوانڈو اور پیانو سیکھنے بھی تو جانا ہے۔ اپنے جانے کی ہزار وجوہات گنا کر وہ دل کو سمجھا رہا تھا۔

مگر یہ بھی تو تیرا گھر ہے؟
نہیں، یہ تو آپ کا گھر ہے۔
مگر ہم بھی تو تیرے ہیں۔ دادی نے اسے بہلایا۔

جب اسے لگا کہ کوئی اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا پھر وہ خود میں کھو گیا۔ باتیں بند کر دیں۔ باتیں کرتا تو آنکھ نہ ملاتا اور مسکراتا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔

اس کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اسے یہاں سب کا انیشن مل رہا ہے نا؟ لگ رہا ہے کہ جو اسے ڈانٹتے ہیں، انہیں بھی کوئی ڈانٹ سکتا ہے۔ دیکھا نہیں، کیسے آپ سب سے ہماری شکایتیں کرتا ہے۔ وہاں تو بیچارہ ڈانٹا بھی جاتا ہے۔

اسے ڈانٹنے کا کیا مطلب؟ دادا جی نے غصے سے کہا۔

اب ہر وقت سوالات پوچھ پوچھ کر جان کھا جاتا ہے۔ اس کے پاس بائیں کو بہت گیان ہے۔ کان پک جاتے ہیں۔ اسی لئے ایک بار کہہ دیا کہ زیادہ

بولو گے تو زبان نیچے گر پڑے گی۔ اسی لئے جب زیادہ بولتا ہے تو اشارہ کرتے ہی چپ ہو جاتا ہے کہ کہیں زبان نہ گر پڑے۔ آج کل کانوں کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے کہ کہیں کان بھی تو غائب نہیں ہو جائیں گے۔ اس کی ماں نے کہا۔

’اس طرح ڈراؤ گے تو ڈر بیٹھ جائے گا اس کے دل میں، اور سوال پوچھنے سے کیوں روکتے ہو؟ سوال پوچھنا اچھا ہے۔ کم سے کم یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے اندر کیا چل رہا ہے۔‘

اس نے دادا کے لئے اک کارڈ بنایا تھا ’گیٹ ویل سون‘ اس میں سفید کاغذ پر لال قلم سے دو تصاویر تھیں چھوٹی چھوٹی۔ ایک کے چشمہ لگا تھا اور مغز بھی پہنے تھے یعنی دادا جی۔ دوسرا وہ خود تھا۔ ان کے اوپر ایک چھاتا سا بھی لگا تھا۔ ماں نے پوچھا تھا، ’یہ کیا ہے؟‘

’ڈرگین‘

’لیکن ڈرگین کیوں؟‘

’دادا جی کی حفاظت کے لئے‘

’اور تمہاری حفاظت کون کرے گا؟‘ پاپا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

میرے ساتھ میں تو دادا جی ہیں۔ دادا جی کے ساتھ کوئی نہیں ہے یعنی کہ حفاظت کے لئے کوئی بڑا ہونا چاہئے۔

ٹیمپلیٹ کے کی بورڈ پر طوفان کی رفتار سے بھاگتی ہوئی اس کی انگلیاں۔ وہ اپنا من پسند کارٹون ڈاؤنلوڈ کر لیتا۔ کچھ اچھا لگتا تو ٹائپ کر کے می پاپا اور بوا کو میج کرتا۔

مٹی کے کھلونے، کپڑے کے، پلاسٹک کے یا چابی سے چلنے والے، ان کا تو شاید اس نے نام بھی نہ سنا ہوگا۔

اس کے پاپا کہہ رہے تھے۔ ’نو، نو، میں تمہیں اپنا پاپا سورت نہیں بتاؤں گا۔‘

مگر اسے معلوم ہے۔ کل اس نے پوچھا تھا کہ اس کا پاپا سورت بتاؤ۔ جب میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تو اس نے فوراً پاپا سورت ٹائپ کر کے کہا۔ ’دیکھو‘

’ارے وہ اس کی ماں کا۔ وہ بھی کیسے پتہ چلا کہ ایک دن اس کی ماں نے اپنی می کو زور سے بول کر اپنا پاپا سورت بتایا تھا اور اسے یاد ہو گیا۔‘ اس کے

ساقی فاروقی



’پاپا بیتی ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ء کا ’نیا دور‘ ساقی فاروقی پر مبنی ہوگا جس میں **بیدار بخت، اسد محمد خان، مشرف عالم ذوقی، زمر دغل وغیرہ کے مضامین** شامل ہوں گے۔

پاپا نے کہا۔

’ایک ہی بار میں یاد ہو گیا؟‘ دادی نے تعجب سے کہا۔

’ہاں، صرف یہی نہیں، اسے سب چیزیں یاد ہو جاتی ہیں بلکہ اگر ہم کچھ بھول جائیں تو ہمیں بھی یاد دلاتا ہے۔‘ اس کی ماں بتا رہی تھی۔

چھ سال کا بچہ، اس کے معصوم سوالوں پر تکنیک نے قبضہ جما لیا ہے۔ وہ ان میں اپنا حل تلاش کر رہا ہے۔ پل پل کبھی کسی چیز کو ڈاؤنلوڈ کر رہا ہے۔ کسی کو کوئی کہانی کا پی پیٹ کر کے میج کر رہا ہے۔ اس کی زندگی میں کہانی سنانے کے فن کی جگہ تکنیک کی اس نئی دنیا نے گھیر لی ہے۔

اس کے پاس ڈائنا سورت کا ذخیرہ ہے۔ وہ ذرا سی عمر میں سب کچھ جان گیا ہے۔ لگا تار پڑھتا رہتا ہے، ٹیمپلیٹ میں تلاش کر کے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا، وہ پوچھتا ہے۔ کئی بار ڈائنا سورت میوزیم میں جا کر صحیح جواب دے کر انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔

جب پلاسٹک کے ڈائنا سورت ٹوٹ جاتے ہیں تو اپنے گھر کے لان میں ایک گڑھا کھود کر اس میں گاڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اسے لگتا ہے ان سے پیٹرول بنے گا جو گاڑیوں کے کام آئے گا۔ ایک بار اس کی ٹیچر نے پیٹرول کی کہانی بتائی تھی تو اس نے اسے اپنی کار سے جوڑ دیا ہے۔

جانے سے پہلے کئی رشتہ دار ملنے آتے ہیں، اس سے پوچھتے ہیں۔ ’تمہارا گھر کہاں ہے؟‘ وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتاتا ہے۔ ’میرے چار گھر ہیں۔ ان چاروں میں ایک میں می پاپا، ایک دادا دادی، ایک نانا نانی کا اور ایک اس کے ماما کا ہے پھر کچھ سوچ کر کہتا ہے۔ ’بٹ یونو، آئی لومائی دادی‘ پھر شرمنا کر ہنستا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

اس کی ساری باتیں جیسے گھر کی چہار دیواری میں قید ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ ابھی آکر کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا۔ ’آؤ دادی کمپیوٹر گیم کھیلتے ہیں‘ اور دیر تک جیتنے کی خوشیاں منائے گا۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر پل صرف اور صرف جیتنے کی ریل پیل ہے۔ ایک معمولی سی شکست بھی ساری فتوحات پر کتنی حاوی ہے۔

□□□

دوسری زندگی



پرل ایس بک

۱۸۸۲ ۱۹۷۲

پیر کی صبح ڈریک فاریٹر معمول سے بھی زیادہ بے دلی کے ساتھ سوکراٹھا۔ سنیچر اور اتوار کے روز اس کے ایجنٹ کا دفتر بند رہتا تھا، اس لیے دو دنوں تک وہ نہ تو کوئی سوال کر سکا اور نہ ہی جواب سن سکا۔ سوال ہمیشہ وہی رہتا اور جواب بھی۔ ”کچھ پتہ چلا نک؟“

”نہیں ڈریک، سوری، اب تک تو نہیں۔ میں نے چارہ تو کئی جگہ رکھا ہے، تمہیں بتایا ہی تھا، مگر کوئی مچلی نہیں پھنسی۔“

”نہیں پھنسی؟“ اگلے دو جملے بھی ہمیشہ وہی رہے۔

”شکریہ نک۔ اگر تھوڑی سی بھی امید۔۔۔!“

”مجھے پتہ ہے اولڈ مین۔ میں پانچ منٹ میں تمہارے دروازے پر رہوں گا۔“ اگلے الفاظ جھجکتے ہوئے بولے بھی جاسکتے تھے، نہیں بھی۔ ”کیا میں تمہیں بتا دوں میں کہاں رہوں گا؟“

”نہیں، نہیں، ابھی ایسا موقع نہیں ملا ہے اولڈ مین۔“ وہ ایک تیسرے درجے کی عمارت میں اپنے ایک کمرے کے فلیٹ سے کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ بس کبھی گھومنے یا کسی سستے سے ریستوراں میں کھانا کھانے باہر جاتا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا، بالکل ختم، شروعات کی امید بھج چکی تھی۔ وہ سارے کردار جو اس نے نبھائے تھے، آخری ڈرامے میں قریب قریب ہیر و تک، اسے کہیں نہیں پہنچا سکے۔ وہ ابھی عمر دراز نہیں تھا۔ مشکل سے پینتالیس کا، لیکن کامیابی کا

سنہراموقع کبھی نہیں آیا۔ اسے جو مواقع ملے تھے اس نے اس سے فائدہ تو اٹھایا، مگر وہ بطور ہیرو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ڈرامہ نگار اس کی عمر کے کرداروں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ وہ جوان، مضبوط، طاقتور کرداروں کو لے کر ڈرامے قلمبند کر رہے تھے۔

امریکہ کی پہلی مصنفہ جنہیں ’ڈگڈارٹھ‘ کے لئے ۱۹۳۸ء میں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ چونکہ ان کے والد کی زندگی کا زیادہ حصہ چین میں گزرا تھا لہذا ان کی کہانیوں میں چینی کسانوں کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور تصانیف میں سنس، ڈینگ ریو لیو، ہینٹ، ڈمدر، ڈپراند، ہرٹ، ڈیپریاٹ، اور گاڈز وغیرہ شامل ہیں۔

پیش ہے پرل ایس بک کی کہانی ’دوسری زندگی‘ جس کا اردو ترجمہ ’قاسم مدیم‘ نے کیا ہے۔

بشکریہ اردو چینل

وہ ایسا نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے باہر پیدا ہوا تھا، اپنے وقت سے بہت پہلے یا بہت بعد میں۔ پرانی دنیا کی تہذیب ختم ہو چکی تھی اور نئی امریکی تہذیب کی ابتداء نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہی سب کچھ سوچ کر خود کو بری کرتا تھا۔ اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

خوش قسمتی سے اس نے شادی نہیں کی تھی، وہ

اور سارہ انتظار کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ پھر سارہ نے کسی اور سے شادی کر لی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے کوئی الزام نہیں دیتا۔ پانچ سال بے حد طویل وقت ہوتا ہے اور اس کے بعد بھی سارہ کو کیا ملتا؟ برسوں پہلے تھا یہ سب، بارہ برس، تین مہینے، دو دن پہلے۔ اس نے سارہ کی تصویر بھی اخبارات میں نہیں دیکھی تھی، اس کے شوہر کے انتقال کے بعد، دو سال، چار مہینے، چھ دن۔ اس نے اسے کوئی چٹھی بھی نہیں لکھی۔

وہ بے دلی سے اٹھا اور اخبار لینے کے لیے دروازے تک آیا۔ فی الوقت یہی لمحات اس کے لیے آرام کے ہوتے تھے جب وہ اخبار لے کر اپنے گرم بستر میں گھس جاتا تھا۔ آج اس کا بستر خاص آرام دہ تھا۔ ٹھنڈی بسنتی ہوا آرہی تھی۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس نے دیکھا بارش ہو رہی تھی۔ کم از کم اس کے پاس کمرے اور بستر کا تو سہارا تھا اور وہ اتنا ہوشیار تو تھا کہ بھوکوں مرنے کی نوبت نہ آئے۔ ایک وقت کھانا اور کرایہ طے تھا۔ اس طرح احتیاط میں کوئی خوشی تو نہیں تھی مگر خراب موسم میں باہر نکلنے کی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ اس نے بتی کی طرف والی دیوار کے پاس اخبار پھیلایا اور تھیز والا صفحہ پلٹ کر اسے غور سے پڑھا۔ کوئی خبر نہیں تھی۔ اس موسم کے سبھی ناکم جم چکے تھے اور اب گرمی کے تھیز میں ہی کچھ توقعات تھی۔ اسے اس بارے میں نک پر زور دے کر بات کرنا ہوگی۔ نک لا پرواہ ہوتا جا رہا تھا، دوستی اور پرانی

نہیں لی۔ اس کی بہن کی برسوں سے کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ شادی کے لیے ٹیکساس میں بس گئی تھی۔ اس کے والدین بیس سال قبل ہی چل بے تھے۔ خدا کا شکر ہے تب یہ بھرم تھا کہ ان کا بیٹا بہت نامی گرامی انسان بننے والا ہے۔ تھیرسماجی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ اس کے باہر آپ کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ اس لیے رشتہ دار، دوست احباب ایک ایک کر کے چھوٹ گئے۔ وہ مری تو گیا تھا۔

یہ مردوں سی زندگی گزارنا بھی عجیب سا احساس پیدا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے کمرے میں زندہ تھا، سانس لے رہا تھا، مگر وہ مرچکا تھا۔ اس کا ڈرامائی دماغ کام کر رہا تھا۔ اس نے کہانیاں پڑھی تھیں۔ اس موضوع پر ایک ڈرامہ بھی دیکھا تھا جب ایک شخص کے مرنے کا اعلان کر دیا گیا مگر اس نے ایک نئی اور مکمل آزاد زندگی شروع کی تھی، سارے قرض معاف ہو گئے تھے۔ ساری ناکامیاں دور ہو گئی تھیں۔ وہ بھی چاہے تو اپنی آزادی کا خیر مقدم کر سکتا ہے، وہ بالکل نیا کچھ کر سکتا ہے۔ نیا نام رکھ کر سب جان پہچان والوں سے دور جا سکتا ہے۔ اس نے خود کو دنیا بھر میں گھومتے دیکھا، ہر شہر میں ایک الگ انسان کی طرح، لندن، پیرس، وینس یا شکاگو اور سان فرانسسکو۔ کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ وہ تھیٹر کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ کچھ بھی کرے، خاتمہ یہی ہوگا، اکیلے کمرے میں، ایجنٹ کام کھوجنے کی کوشش میں لگا ہوا۔ اور کیا کوئی ایجنٹ بنا کسی پہچان والے آدمی کے لیے کام تلاش کرے گا؟ کم از کم ڈریک فاریسٹر کبھی کچھ تھا تو! ایک یاد تو تھی۔ طویل عرصے سے وہ رویا نہیں تھا مگر آج اسے رونا آ گیا۔ چند آنسوؤں کے قطرے گرے وہ بھی خود کے لیے نہیں بلکہ اس جیسے ہر کسی شخص کے لیے۔ وہ اکیلا تو نہیں ایسی حالت میں۔ خود کو بھرم میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے پاس تھوڑا سا ہنر

”اوہ...!“ وہ ہچکچایا۔ اس ٹھنڈی آواز کے آگے کیا کہا جائے، یہ نہ سمجھ پاتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔ ایک پل بعد وہ بستر میں تھا اور اس نے

قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، نوری، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کر دیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سودا، مصحفی، انشا، مومن، ذوق، غالب اور اس کے بعد منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دور حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امر وہہ، الہ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تین نئی نسل کا رجحان کیا ہے۔ ادارہ نیادور بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

(ایڈیٹر)

آنکھوں تک چارو اوڑھ لی تھی۔ اخبار زمین پر گر پڑا اور تنہائی میں ڈوب گیا۔ کسے فکر تھی کہ یہ خبر سچ ہے یا نہیں؟ طویل عرصے سے کسی نے اس کی کھوج خبر

کامیابی کے روابط ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ پھر بھی وہ کسی اور ایجنٹ کے پاس جانے کی ہمت نہیں بٹھا سکتا تھا، اگر کوئی اور اسے لے لیگا تب بھی۔ نیکم کم از کم اسے جانتا تو تھا۔ اسے یہ نہیں بتانا پڑتا کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے۔

اسی پل پلستر کی ہوئی دیوار پر پہلے سے بے ترتیب بتی گر پڑی۔ اس نے غصے میں اخبار پھینک دیا اور پھر سمیٹنے اٹھا ہی تھا کہ پھیلے ہوئے صفحات سے اسے اپنا نام جھانکتا نظر آیا۔

”ڈریک فاریسٹر اپنے گھر میں مردہ پائے گئے۔“

یہ آخری صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی۔ وہ اسے کھڑکی کے پاس لے گیا اور اپنی ہی موت کی خبر پڑھنے لگا۔ ”ڈریک فاریسٹر، اداکار اپنے بستر پر مردہ پائے گئے۔ انہیں لفٹ مین نے دیکھا جو اخبار پہنچانے آیا تھا۔ مسٹر فاریسٹر نے ابتدا میں مشہور براڈوے ڈراموں میں کام کیا تھا۔ انہیں ہالی ووڈ سے بھی کئی بار بلاوا آیا، مگر انہوں نے اسٹیج کو ہی فوقیت دی اور ہالی ووڈ کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ حالیہ برسوں میں -----“ اخبار اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ وہ نیک کو فون کرنے دوڑا۔ اس خبر کی تردید کرنا ضرور تھا۔ نیک کو پریس میں خبر کرنی ہوگی، وہ اخبار والے کو نوٹس بھیجے گا۔ ادھر سے ہلکی سی آواز آئی، ”نکولس جین سین ایجنسی۔“

”اوہ، ہاں!“ اس نے ہمیشہ کی طرح پریشانی میں ہکلاتے ہوئے کہا، ”کیا مسٹر جین سن ہیں؟“

”مسٹر جین سن آج نہیں آئیں گے۔“
 ”اوہ، کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہوں گے؟“
 ”وہ یہاں نہیں ہیں۔ وہ ایک اہم کلائنٹ کے
 ساتھ ویک اینڈ منانے گئے ہیں۔“

تھا، تھوڑی سی صلاحیت، اچھا بدن اور خوبصورتی۔
ہاں، وہ خوبصورت تھا، اب بھی ہے۔ یہ سب چیزیں
مل کر اسے اوسط سے کچھ اوپر لے آئے تھے۔ مگر یہ
کافی نہیں تھا اور اس سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے
اتنا کافی نہیں ہوگا۔

بہتر ہے کہ مر ہی جاؤں؟ یہ آسان ہوگا۔ اس
نے اس بارے میں سوچا تھا۔ ایک اکیلے اور نام شخص
کی طرح۔ کبھی اس طرح کا قدم اٹھانے کے بارے
میں طے نہیں کیا تھا۔ مگر پھر بھی امکان تھا۔ روزانہ رات
کو نیند کی گولیاں ننگے وقت وہ سوچتا کہ موت اس کی
ہتھیلیوں پر ہے۔ سفید سفید چھوٹی گولیاں دیکھتے ہوئے
وہ اپنی معمولی صلاحیت کے ساتھ سوچتا۔ اگر وہ چاہے تو
ایسا کر سکتا ہے۔

اب کسی اور نے اس کے لیے یہ سب کر دیا
تھا۔ اس کے ہم نام شخص نے۔ اس نے اخبار اٹھایا
اور دوبارہ پڑھا۔ اس کی موت کا کوئی سبب نہیں
دیا گیا تھا۔ بس خبر دی گئی تھی اس کی کچھ کامیابیوں
اور آہستہ آہستہ اسٹیج سے دور ہونے کی وضاحت کی
گئی تھی، یہ سب قابل افتخار لگ رہا تھا۔ اگر ابھی وہ
سچ مچ مر گیا تو اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ یہ
گندہ سا کمرہ، بک کے پیچھے مسلسل لگے رہنا، بچہ
پرانی قمیض اور پا جاسے، یہ سب چھوٹی چھوٹی اور
بیکار باتیں جو وہ زندہ رہ کر تو چھپا سکتا تھا مگر موت
کے بعد یہ سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔ اسے تو شکر
گزار ہونا چاہیے کہ کوئی اس کی جگہ اتنی اچھی طرح
مر گیا ہے۔ انہوں نے پتہ صحیح دیا تھا، یہی
عمارت، یہی سڑک۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اور
اچانک اسے بھوک کا احساس ہوا۔ وہ اٹھے گا، کافی
اور ٹوسٹ بنائے گا اور بک کو کبھی فون نہیں کرے گا۔ وہ
یہاں سے چلا جائے گا، کبھی مغربی سمت نکل جائے
گا۔ پھر یوں ہی ہالی ووڈ میں کوئی کام تلاش کر لے

گا، سیٹ کے آس پاس۔ دیکھ بھال کرنے والے کا کام
بھی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیوں کہ اس کا نام
مرچکا تھا۔

بستر کے پاس کی میز پر وہ کافی پی رہا تھا کہ
فون بج اٹھا۔ وہ اٹھا اور کریڈل کان سے لگایا۔
ایک اجنبی آواز، کسی خاتون نے کہا، ”کون بول رہا
ہے، پلیز؟“ اپنا نام اس کی زبان تک آیا، لیکن اس



نے قدرے توقف کے بعد کہا، ”آپ کو کون
چاہیے؟“

”میں نے ابھی ابھی اخبار میں دیکھا۔ میں
ڈریک فاریسٹر کو جانتی تھی، چند سال پہلے۔ ہم نے
ایک ڈرامے میں ایک ساتھ کام کیا تھا۔ وہ بہترین
اداکار تھا، میں اکثر سوچتی..... اور اب وہ
نہیں رہا۔“ وہ ہچکچایا اور پھر اسی بھاری آواز میں
بول اٹھا، ”سوری میڈم، آپ کے پاس غلط نمبر
ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا اور بستر پر بیٹھ

گیا۔ لیکن یہ حیرت انگیز تھا واقعی۔ وہ خالی دیوار کو
گھورتا آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا
بیٹھا رہا۔ لیکن آواز یاد نہیں کر پایا۔ چلو کسی نے تو یاد
رکھا۔ اسے خوشی ہوئی اور اس نے بارش کا حال
دیکھنے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ موسم خوشگوار
ہونے پر وہ گھومنے نکل جاتا۔ مگر اب بھی بارش
ہور ہی تھی۔ وہ واپس بستر میں داخل ہوا ہی تھا کہ
دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ پھر اٹھا اور دروازہ
کھولا۔ عمارت کا پہریدار پھولوں کا چھوٹا سا باکس
لیے کھڑا تھا۔

”اوہ، شکریہ۔“ ڈریک نے کہا۔ ”ایک منٹ
رکو۔“ اس نے کرسی پر رکھی پینٹ کی جیب سے ایک چیز
نکالی اور اسے دی۔ ”شکریہ۔“ پہریدار نے کہا۔

دروازہ بند کر کے اس نے باکس کھولا۔ سفید
گلاب اور اسٹیپ ڈریگن تھے، ہرے فرن کے
ساتھ۔ کارڈ پر تحریر تھا، بہترین وفات کی یاد
میں، اور نیچے سات نام درج تھے۔ اسے وہ لوگ
یاد تھے۔ ”ڈریڈ سرکل“ ڈرامے میں ان لوگوں نے
چھوٹے چھوٹے کردار ادا کیے تھے۔ اس سال یہ
ڈرامہ ہٹ ثابت ہوا تھا۔ یہ تھریٹر تھا اور وہ قتل کی
گئی ہیروئن کا شوہر بنا تھا۔ مگر اس ڈرامے کا ہیرو
عاشق تھا، شوہر نہیں۔ پھر بھی اچھا چلا تھا ڈرامہ اور
اس نے وہ پیسے سارے شادی کرنے کے لیے جمع
کیے تھے۔ لیکن اسی سال سارہ نے ہیروئن بچ سے
شادی کر لی تھی۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں
پڑتا۔ اگر وہ کامیاب ہوتا تو اس نے بھی کسی سے
شادی کر لی ہوتی۔

اس نے پھولوں کوٹن کی ٹوکری میں ڈالا اور پانی
بھر کر کھڑکی میں رکھ دیا۔ اس نے پھر سونے کی بجائے
باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اپریل تھا اور آسمان صاف
ہو رہا تھا۔ اس نے شاور لیا اور سلیپے سے کپڑے زیب
تن کیے۔ جب تک سڑک پر آیا بادل چھٹ رہے تھے

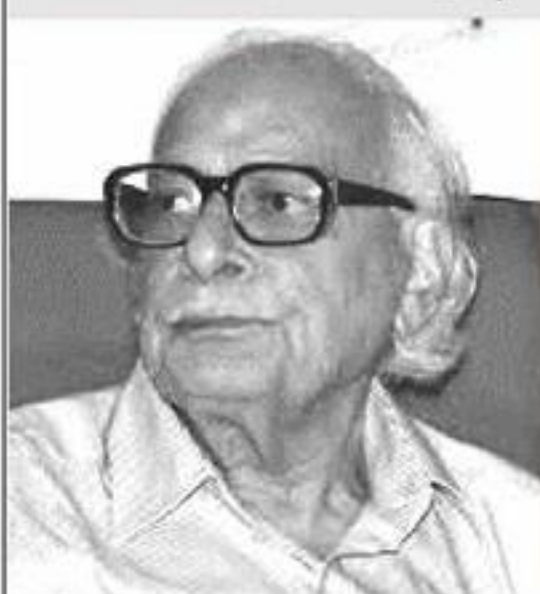
اور نیلا آسمان سچ سچ سے جھانک رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چھ بلاک گھوما اور چونکہ کوئی اسے نام سے نہیں جانتا تھا، اس لیے کوئی حیرت زدہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے ایک ڈرامے سے متعلق میگزین خریدا۔ اور سوچا کہ پارک میں بیٹھنے کے لیے موسم ٹھنڈا ہے یا نہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ موسم زیادہ سرد ہے اس لیے وہ واپس کمرے میں چلا آیا۔ بک کوفون نہیں کرنے سے اس کے پاس کام نہیں تھا مگر اس نے فون نہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب وقت آئے گا سوچا جائے گا کہ کہاں جانا ہے، یا پھر وہ کہیں نہیں جائے گا۔ جب وہ کمرے میں آیا تو دروازے میں ایک لفافہ لٹکا ہوا تھا۔ یہ بک کا تار تھا؟ خدا کے لیے مجھے فون کرو۔ گھنٹوں سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔ شہر کے لیے پہلی ہی ٹرین سے لوٹ آیا ہوں۔“

وہ بیٹھ گیا۔ ہیٹ اب بھی اس کے سر پر تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا، بک کو اس کے مرنے کا یقین تھا یا نہیں؟ شاید اس نے خبر دیکھی ہو اور بھروسہ نہ کیا ہو۔ یا پھر بک کو لگا کہ اس کے ساتھ کوئی رہتا ہوگا۔ اس نے بک کو کبھی اپنے رہنے کے ڈھنگ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بک کو لگتا تھا کہ اس کی کوئی محبوبہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی نے تار بغل میں پھولوں کے گلدان کے پاس رکھ دیا اور باہر چلا گیا۔ پارک کی بیچ پر اس نے پورا میگزین پڑھ ڈالا۔ پھر وہ دوسرے لوگوں کو دیکھتا، کچھ سوچتا بیٹھا رہا۔ کچھ لوگوں کو اس نے پہچانا۔ اسے لگا کہ وہ لوگ بھی اسے پہچان رہے ہوں گے۔ لیکن ان کی کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کا وقت ہو رہا تھا اور اس نے کسی آٹومیٹ میں کھانا کھانے کا ارادہ کیا۔ پھر واپس جا کر کمرے میں سونا۔ وہ اپنے ہی احساسات کی بے ترتیبی سے تھک گیا تھا۔ مرجانا بھی ایک قسم کا تجربہ ہے، وہ مسکرایا۔

پرانی عمارت میں داخل ہوتے وقت پہریدار

باہر نکلا، ”آپ کی سالگرہ وغیرہ ہے کیا؟“ اس نے کہا۔ ”آپ باہر تھے تو دو گلدستے اور تین تار آئے ہیں۔“

”آج میری برسی ہے۔“ ڈریک نے



تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا

معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی
فضیل جعفری بھی نہیں رہے۔
ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں
ہوتا تھا۔ ان کی غیر ادبی تحریریں بھی
ادبی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔
ادارہ نیادور، جلد ہی فضیل جعفری کی
ادبی خدمات پر ایک شمارہ معنون کرنے
کا ارادہ رکھتا ہے جس میں اسرار گاندھی،
علی احمد قاسمی وغیرہ کے مضامین شامل رہیں گے

کہا اور دوسرا ڈانم نکال کر پہریدار کو دیا۔ گلدستے اٹھائے ہوئے اس نے تار جیب میں رکھے اور اوپر چڑھ گیا۔ یہ سب عجیب سا ہوتا جا رہا تھا، اس کا کمرہ پھولوں سے بھر گیا اور اتنے تار۔ یہ تو واپس تھیں ڈرینگ روم میں ہونے جیسا تھا۔ موت

کی خبر پڑھ کر وہ خوش ہی ہوا تھا۔ اس نے خود کو پوری طرح بھلا دیا گیا سمجھا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے پھولوں کو گلدان میں رکھ دیا۔ پیلے گلاب اور سفید سائریا۔ اس کے پہلے ڈرامے کے ہدایت کار کی طرف سے۔ تار اس کے دوسرے ڈراموں کے اداکاروں نے روانہ کیے تھے اور ایک تار بک کے آفس میں کام کرنے والی لڑکی کا تھا۔

ڈریک کو معلوم تھا کہ وہ اس کے خواب دیکھتی ہے مگر ان دنوں وہ سارہ کی بے وفائی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کارڈ ہاتھ سے لکھا تھا، ”پیاری و خوشنما یادیں“ لوکیں۔ وہ اسے ہمیشہ مس سلور شین پکارا کرتا تھا۔

کمرہ اچھا لگنے لگا تھا۔ اس نے بستر نہیں بچھایا۔ اکثر وہ اسے ایسے ہی چھوڑ دیتا تھا اور واپس لیٹ جاتا تھا۔ مگر آج اس نے اچھی طرح بستر سمیٹا۔ ایک پرانے رومال سے میز، الماری اور کھڑکی جھاڑی۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے پیلے گلاب اور اسپائریا نکال کر ایک دودھ کی بوتل میں الماری پر رکھ دیئے۔

پھر فون بجنے لگا اور اتنا بجا کہ یا تو اسے باہر جانا پڑتا یا اٹھانا پڑتا۔ اس نے اطمینان سے فون اٹھایا آواز بدل کر بولا، ”ہیلو“ مگر یہ بک نہیں تھا، یہ کسی خاتون کی آواز تھی جو بے حد نرم و سریلی تھی۔ ”ہیلو، کیا ڈریک فاریٹر یہیں رہتے تھے؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر اس نے آواز پہچان لی۔ اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ یہ سارہ تھی۔ اس کی آواز آج تک سنی ان سنی آوازوں میں سب سے پیاری تھی۔

”میں نے ابھی ابھی یہ دکھ بھری خبر پڑھی۔“ سریلی آواز آئی۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں اس کی سروسیس کہاں ہوں گی؟ میں اسے برسوں پہلے جانتی تھی۔ میں اسے

سی حرکت ہے۔ کہاں ہو تم صبح سے؟ مجھے معلوم ہے تم زندہ ہو؟“

”تمہیں کیسے معلوم تھا؟“ اس نے جاننا چاہا۔ اسے کچھ برا لگا۔ کیا تک کو لگا کہ اس میں اتنی ہمت نہیں، تھوڑی دیر کے لیے مجھے لگایہ سب سچ ہے، جھوٹے کہیں کے!“ تک نے کہا، ”پھر میں نے خبر دوبارہ پڑھی اور دیکھا کہ وہ تم نہیں ہو۔ وہ تمہیں پینسٹھ سال کا بتا رہے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں؟“

”نہیں۔“ ڈریک نے کہا۔

”تمہیں کبھی تاریخیں یاد نہیں رہیں۔“ تک نے جلدی سے کہا، ”انہوں نے تمہاری تاریخ پیدائش ۱۸۸۷ء لکھی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سچ نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے اتنی تشہیر کا کام کیا ہے۔ اخبار اسے کل درست کر دے گا۔ میں صبح سے ہی بے حد مصروف رہا ہوں۔ لگتا ہے ورجینیا میں کوئی اور تمہارا ہم نام بھی تھا۔ اخبار والوں نے سب غلط ملط کر دیا ہے۔ اس سے سب گڑبڑ ہو گئی ہے۔ خیر اس سے تمہیں فائدہ ہی ہوا ہے۔ تمہیں ایک کردار مل گیا ہے۔“

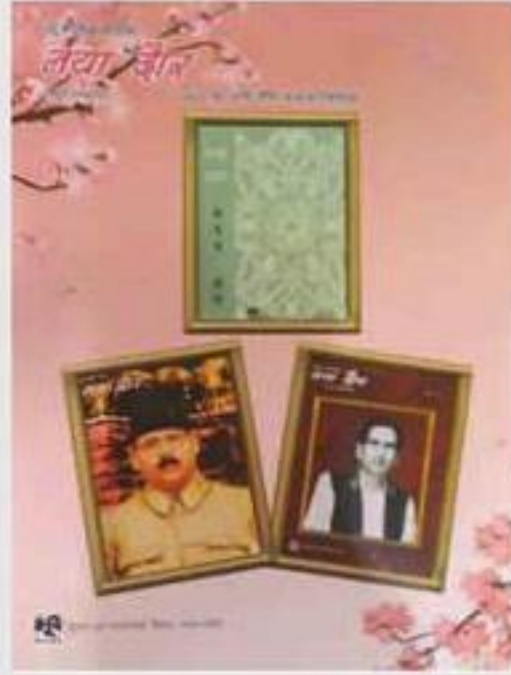
”ہاں، اچھا خاصہ کردار۔ ویسے کوئی اسٹار والا رول تو نہیں ہے مگر ڈرامہ اچھا ہے۔ ساؤتھ سائڈ آف ڈمون، پہلے گرمیوں میں پھر براڈوے۔ پروڈیوسر نے کہا کہ وہ تمہیں جانتا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا تھا اور کہا کہ اگر اسے اتنا پتہ معلوم ہوتا تو وہ تمہیں ضرور کام دیتا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے کچھ وقت دو۔ تم سیدھے یہاں چلے آؤ، ڈریک! اور میں کنٹریکٹ تیار رکھوں گا۔ ہم سب کچھ درست کر لیں گے۔ اب میں پھر چیزوں پر دھول جمنے نہیں دوں گا۔“

ڈریک طے نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ ایک ساتھ دو جگہوں پر نہیں جاسکتا تھا۔ یا تو وہ پہلے سارہ کے پاس جاتا یا تک کے پاس۔ اس کا ڈرامائی تخیل پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو سارہ کے ہال میں یا پھر

بجاتے ہوئے، اپنی شناخت کا انتظار کرتے ہوئے۔ وہ دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔

فون پھر بج اٹھا اور پھر سے سارہ کے ہونے کی

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں



’نیا دور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ’اودھ نمبر‘، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر‘ بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ ’نیا دور‘

امید میں اس نے فون کا ریسیور اٹھالیا اور پکڑا گیا، ”ہیلو...!“ اس نے بڑی بے تابی سے کہا۔ یہ تک تھا، حیران پریشان۔ ”یہ کیا بے وقوفوں

بہت پیار کرتی تھی۔ اب بھی کرتی ہوں، مگر اب میں اسے کبھی نہیں بتا سکوں گی۔“

وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ کہتا بھی کیا؟ پھر بے وقوفوں کی طرح چند الفاظ اس کے منہ سے نکلے، ”آپ نے اسے بتایا کیوں نہیں؟“

ادھر سارہ حیرت زدہ تھی، ”کیا آپ اس کے دوست ہیں؟“

”ایک طرح سے دوست ہی ہوں۔ اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“

”اوہ، سچ سچ! تو وہ مجھے بھولا نہیں تھا؟“

”کبھی نہیں۔“

وہ ان واقعات سے حیرت زدہ تھا۔ کیا یہ نیا جال تھا جس میں وہ خود ہی پھنستا جا رہا تھا۔

”اوہ، کیا آپ آکر مجھے اس کے بارے میں بتائیں گے۔“ اس نے درخواست کی۔

”آپ کہاں ہیں؟“

سارہ نے کافی دور دراز سڑک کا نمبر بتایا۔ جہاں وہ تھا وہاں سے بڑی دوری پر۔ ”مجھے پتہ نہیں کب...“ اس نے شروع کیا۔

”نہیں، آپ ابھی آئیے۔“ سارہ نے پھر درخواست کی، ”مجھے اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا تجسس ہے۔ تب میں آپ کو بتا سکوں گی کہ کیوں... دراصل میں نے اسے کھو دیا۔ جب میرے شوہر نہیں رہے تو مجھے پتہ نہیں چلا، میں اسے کہاں تلاش کروں؟ اخباروں میں بھی اس کا نام نہیں آتا تھا۔ آج میں نے خبر پڑھی تو مجھے لگا کہ میں ہمیشہ سے اسے تلاش کرنا چاہتی تھی۔ مجھے لگتا ہے میں بس سوچتی رہ گئی۔“

”میں آؤں گا۔“ اس نے وعدہ کیا۔ اس نے فون رکھ دیا۔ پتہ نہیں یہ وعدہ پورا کرے گا یا توڑ دے گا۔ مگر اسے اب سارہ کا ٹھکانہ مل گیا تھا تو آج نہیں توکل، اسے معلوم تھا کہ وہ اس کی دلیز پر کھڑا ہوگا۔ گھنٹی

چاہیے۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ شاید کوئی کام کی چیز، کتاب یا کچھ اور تلاش کرنے لگا تاکہ بطور نشانی دی جاسکے۔ پھر وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا، ”پھول اور کیا؟“ اس نے سارے پھول سمیٹے۔ ایک باکس نکالا۔ سارے پھول اس میں ڈالے اور بڑی احتیاط سے ڈوری باندھی۔ پھر اس نے الماری کھولی اور گھڑی نکالی پتلی بید کی چھڑی جس کے اوپر نقلی ہاتھی دانت کی نشانی تھی۔ یہ چھڑی اس نے اس ڈرامے کے لیے خریدی تھی جس میں وہ شوہر بنا تھا۔

شیشے کے پاس رکھتے ہوئے اس نے ایسے شخص کو دیکھا جسے اس نے ایک طویل عرصے سے نہیں دیکھا تھا، دراز قد، دبلا پتلا شخص۔ جس کا زرد چہرہ زندگی سے معمور تھا، چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس کی گہری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ معصوم سا شخص۔ وہ اپنا عکس دیکھ کر مسکرایا۔ اس دوسرے جنم پر بے حد خوش۔ وہ جس قدر پہلے مر چکا تھا اس کے مقابلے میں یہ برا نہیں تھا۔ ’نیک خواہشات‘ اس نے خوشی و انبساط سے دیکھتے چہرے سے کہا اور ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے اسے ذرا ترچھا کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

□□□

باتیں بتادیں گے تب وہ گھڑی کی جانب دیکھے گا اور چلائے گا۔

”اوہ خدا، ڈارلنگ، مجھے آج کسی سے ملنا ہے۔ میں بھول ہی گیا تھا۔ تمہاری وجہ سے میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔“

”کوئی ڈرامہ ہے ڈریک؟“

”ہاں، ساؤتھ سائڈ آف ڈیمون۔ نیا ہے، اچھا لگتا ہے۔“

”جلدی آنا۔“ وہ یہی کہے گی۔ ”مجھے تم پر فخر ہے ڈریک۔“ یہی کہے گی وہ۔

”میں جلدی آ جاؤں گا۔“ وہ وعدہ کرے گا۔ ”ہم ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ اچھا؟ پھر ہم بیٹھ کر کچھ سوچیں گے۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ یہی کہے گی وہ، اپنی میٹھی آواز میں۔ یہ آواز پہلے سے بھی زیادہ شہد بھری تھی۔ وہ تیار ہونے کے لیے کمرے میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس کے پاس ایک نئی قمیض تھی۔ وہ ہمیشہ ایک نئی قمیض رکھتا تھا۔ کیا پتہ کسی ہدایت کار سے اسے ملاقات کرنی پڑے۔ پھر اس نے شاور لیا اور داڑھی بنائی۔ پھر نئی قمیض اور اچھا سا سوٹ۔ وہ ہمیشہ ایک اچھا سا سوٹ رکھتا تھا۔ پھر اس نے کچھ سوچا۔ اس کے لیے کچھ لے جانا

دیوان خانے میں انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر سیزھیوں سے اترتی ہوئی سارہ، ہمیشہ سے ہی خوبصورت۔ وہ بالکل خاموش کھڑا ہے گا۔ انتظار کرتے ہوئے، پھر وہ چلائے گی، ”اوہ، ڈریک ڈارلنگ۔ لیکن یہ سب کیسے؟“

”کوئی اور مرا ہے سارہ، میں نہیں۔“

اس نے بوسہ لینے کے لیے آنکھیں موندیں اور نازک لب یاد کیے۔ سارہ بے حد نازک تھی۔ شہد بھرے لب تھے اس کے۔

”اے تم سو گئے ہو کیا؟“ نک اس کے کان میں چلایا۔

”میں ابھی نہیں آسکتا نک۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔“

”کیا کام ہے؟“ نک نے چیختے ہوئے کہا۔ ”کنٹرکٹ سے زیادہ کیا ضروری ہے؟“

”ہے کام، بے حد ضروری۔“ ڈریک نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا، ”لیکن کنٹرکٹ بنا کر رکھو نک۔ میں وہاں آؤں گا کسی بھی وقت۔ آج کل یا کسی اور دن۔“ اس نے فون رکھ دیا اور کھویا سا کھڑا رہا۔ وہ آج وہاں جائے گا۔ جب وہ اور سارہ صوفے پر بیٹھ جائیں گے اور ایک دوسرے کا بوسہ لیں گے۔ کھانا کھائیں گے اور ایک دوسرے کو جب ساری

اودھ نمبر کتابی شکل میں

’نیا دور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ’اودھ نمبر‘ بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ ’نیا دور‘



لاٹری



واسیل یوسفی

کنوینر سندھی صلاح کار کمیٹی، احمد آباد

دن اچھا نکلا۔

کئی تاجروں سے وصولی ہوئی۔ کم سے کم دو لاکھ روپے تو نقد ہوں گے۔ پچاس ہزار کے چیک ہیں، کیش ہو جائیں گے۔ انہیں بھی نقد ہی ماننا چاہئے۔ نوٹ اور چیک۔ احتیاط سے ایک بڑے لفافے میں رکھ کر پن لگا دی۔ رقم اتنی بڑی مگر لفافہ کتنا چھوٹا بنا ہے! بڑے نوٹ چھاپ کر حکومت نے بہت اچھا کیا۔ کتنی سہولت ہو گئی ہے۔

سیپل کے بڑے تھیلے (بیگ) میں نوٹوں والا لفافہ ڈالتا ہوں۔ اندر سے نیپکن نکال کر چہرے سے پسینہ خشک کرتا ہوں۔ بہت گرمی ہے۔ نیپکن واپس رکھ کر بیگ کی زپ لگا دیتا ہوں۔ اب پاپا کو یقین آئے گا کہ میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ میں زیادہ تعلیم نہیں حاصل کر سکا۔ دل ہی نہیں لگتا تھا۔ دوسری طرف میری ضد تھی کہ میں بزنس کروں گا۔ نہیں کرنی ہے مجھے ملازمت، کسی کی غلامی۔

’بزنس کے لئے روپے چاہئے۔ کہاں ہے ہمارے پاس؟‘

’پاپا! آپ تو بس مجھے کہیں سے تین لاکھ کا انتظام کر دیں۔ باقی میں خود کروں گا۔‘

’پاپا نے تمام عمر کپڑے کی دکان پر نوکری کی تھی۔ بڑی مشکل سے گھر چلاتے تھے۔ تین لاکھ کہاں سے لاتے۔ میں بھی ضد پر اڑا رہا کہ کروں گا تو بزنس کروں گا، نہیں تو گھر بیٹھ کر روٹیاں کھاؤں گا۔ لاڈلا، اکلوتا بیٹا ہوں اس لئے مئی کچھ زیادہ ہی دھیان رکھتی

ہیں۔ روٹی پر گھی زیادہ چڑتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ ہیں۔‘

آخر پاپا نے ہمت کی۔ ایک پرانے دوست سے بات کی۔ دوست نے کم سود پر دو لاکھ روپے دے دئے۔ مئی نے اپنے زیورات نکالے۔

میں ابتدا میں تھوڑا سہم گیا۔ بزنس میں نقصان بھی تو ہو سکتا ہے۔ مگر پاپا نے حوصلہ دیا۔ اب جب سوچ لیا ہے تو آگے بڑھو۔ جھولے لال کی مہربانی سے سب اچھا ہوگا۔‘

سندھی زبان کے مشہور ادیب واسیل یوسفی

’موسیٰ‘ کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں تضاد، صبح کتنے آہے، برف جو ٹھہیل خاصی شہرت کی حامل ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ’برف جو ٹھہیل‘ پر ۱۹۹۹ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی ’لاٹری‘ جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر بانو سرتاج نے کیا ہے۔

زیورات فروخت ہونے پر چھیاسٹھ ہزار روپے ہاتھ آئے۔ کچھ نقد، کچھ ادھار پر مال اٹھالیا۔ ہو گئی دکان شروع، شرٹ کا بزنس بھی کافی دلچسپ بھی ہے اور کمائی والا بھی۔ ہاں ادھاری زیادہ دینی پڑتی ہے، کارنگروں سے ماتھا پیگی بھی کرنی پڑتی ہے تو پیکنگ کرنے والوں کے خنجرے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

آج پہلی مرتبہ وصولی کے لئے نکلا تھا۔ اچھی

وصولی ہوئی ہے۔ آرڈر بھی بہت ملے ہیں۔ گیٹ ہاؤس کا رخ کرتا ہوں۔ وڑودہ میں ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کروں گا۔ وصولی کرنے کے لئے نہیں، وصولی تو میرے ملازم کریں گے۔ میں صرف گاہکوں سے ڈیل کرنے کے لئے آؤں گا۔ میرے برانڈ کی شرٹ کیسی لگتی ہیں؟ کپڑا کیسا لگتا ہے؟ میرے برانڈ کو گراہک کتنا پسند کرتے ہیں؟ دوسرے بزنس والوں کے مقابلہ میں میری شرٹس کی مانگ کتنی ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں، ہاں، مارکیٹ سروے کرنے کے لئے آؤں گا۔ پھر تمام عمر ہی آلتو فالتو سستی شرٹس تھوڑے ہی بنواتا رہوں گا میں! بڑا مینوفیکچرر کہتے ہیں نا، وہ بنوں گا۔ پاپا صحیح کہتے ہیں۔ ناچ ضروری ہے، سب کچھ ملے گا۔ میں بڑی گارمنٹ فیکٹری لگاؤں گا۔ مئی بے حد خوش ہوں گی۔ ان کے لئے بیس بیس ہزار روپے کی بنارسی ساڑیاں خریدوں گا۔

بھوک لگی ہے۔ گیٹ ہاؤس سے کچھ پہلے رکشہ سے اتر جاتا ہوں۔ اندھیرا ہونے لگا ہے۔ سڑک کے کنارے ایک نوجوان لڑکی نے اسٹال لگا رکھا ہے۔ آلیٹ بنا کر گراہکوں کو دیتی نظر آرہی ہے۔ چائے بنا کر بھی پلا رہی ہے۔ کمال کی پھر تیلی ہے۔ تیکھے نین نقش، بڑی بڑی کالی آنکھیں، رنگ اجلا، سب کچھ اجلا اجلا لگ رہا ہے۔ سوچتا ہوں، یہیں کچھ کھالوں۔ گیٹ ہاؤس والے تو لوٹتے ہیں۔ چائے کے ہی بیس روپے لے لئے کل۔ لڑکی کے ریسٹوران میں لوگوں کی بھیڑ

ہے۔ ایک چھوٹے چبوترے پر اسٹو رکھا ہے۔ اسٹو پر تو ہے۔ توے پر چچہ سے تیل ڈال کر، انڈا پھوڑ۔ پھینٹ کر نمک مرچ ڈال کر وہ توے پر پھیلا دیتی ہے۔ جلدی جلدی آلیٹ بنانے کے ساتھ توے کے ایک کونے میں سینکنے کے لئے بریڈ سلائس بھی رکھ دیتی ہے۔ پھر وہیں کے وہیں آلیٹ سنیڈ وچ بناتے ہوئے سچ سچ میں چائے کی پتیلی اسٹو پر رکھ دیتی ہے۔ اس کی پھرتی چستی دیکھ کر میں حیرت زدہ ہوں۔ یہ سوچ کر کہ وہ پہلے آئے گراہوں کو پنہا دے تب میں آگے بڑھوں گا۔ ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں۔ لڑکی کی پشت کی طرف دیوار پر چھوٹے سے بورڈ پر اندھیرے کے باوجود ریٹ لسٹ صاف نظر آرہی ہے۔ ایک انڈے کا آلیٹ اور دو سلائس، دو انڈوں کا آلیٹ اور سلائس۔ ٹوسٹ تیل میں، ٹوسٹ مکھن میں، چائے، میں رک جاتا ہوں۔ پوری فہرست نہیں پڑھتا۔ بے وقوف ہوں، میں نے چائے گیٹ ہاؤس میں کیوں پی؟

کرم جلی، او کرم جلی! اچانک اسٹال کے پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی۔

’ابھی آئی‘ لڑکی نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ اس کا رسپانس اتنا فطری تھا جیسے کرم جلی ہی اس کا نام ہو اور وہ اس سے مانوس ہو۔ اس نے اسٹو کی لو ڈھیمی کی، آنکھوں ہی آنکھوں میں گراہوں سے اجازت طلب کی اور چبوترے سے سٹی پتلی گلی میں چلی گئی۔ جلدی ہی وہ لوٹ آئی۔ شاید بیماری کی کوئی فوری ضرورت رفع کروانے گئی تھی۔ لوٹ کر اس نے پہلے مٹی کے تیل کا چراغ جلا یا۔ اندھیرے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

گراہک اب کم ہو گئے ہیں۔ میں بیٹھنے کی جگہ کی تلاش میں نظریں گھماتا ہوں۔ ایک جگہ دو پتلی پٹیاں ڈال کر بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی نظر آئی۔ ایک گراہک وہاں پہلے ہی سے بیٹھا ہے۔ چبوترے کے پاس بنی اس جگہ پر میں بھی بیٹھ جاتا ہوں۔ مگر بیٹوں کی

چوڑائی کم ہونے سے گرتے گرتے بچ جاتا ہوں۔ دیوار کا سہارا نہ ہوتا تو گر ہی جاتا۔ سنبھل کر بیٹھتا ہوں اور بیگ احتیاط سے گود میں رکھ لیتا ہوں۔ لڑکی میری طرف دیکھتی ہے۔

ایک انڈے کا آلیٹ، دو سلائس اور چائے۔ چار گراہک جو ایک ساتھ تھے پیسے دے کر جاتے ہیں۔ پتلی پٹی پر بیٹھا گراہک بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں بیگ پٹی پر رکھ کر زپ کھولتا ہوں اور نیپکن نکالتا ہوں۔ بیگ گر جاتا ہے۔ میں اسے اٹھا کر پھر پٹی پر رکھتا ہوں۔ نیپکن سے پسینہ پونچھ کر اندر رکھتا ہوں اور زپ بند کر دیتا ہوں۔

لڑکی توے پر انڈے پھیلا رہی ہے۔ پھر وہ چبوترے پر رکھی ہوئی جھوٹ پلینیں اٹھا کر پانی سے بھرے ٹب میں ڈالتی ہے۔ میرے ساتھ بیٹھا گراہک پیسے دے کر جاتا ہے۔

’مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں چلتا ہوں‘ گلی سے کسی مرد کی آواز آتی ہے۔

’ایک وقت کی نماز نہ پڑھنے سے تمہاری جنت خطرے میں نہیں پڑ جائے گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ جا کر میری دعا خرید لاؤ۔ میں مر رہی ہوں۔‘

یہ آواز پہلی آواز سے زیادہ اونچی تھی۔ آواز اسی عورت کی ہے جس نے لڑکی کو کرم جلی کہہ کر پکارا تھا۔ ایک بوڑھا شخص لڑکی کے پاس آتا ہے۔ اس کی سفید داڑھی ٹھنڈی اور اس کے آس پاس انگی ہوئی ہے۔ اس کی پیشانی پر سجدوں کا گہرا نشان ہے۔ نماز کا چٹا۔

جیلہ! سورو پئے دے دے بیٹی! نماز کے بعد لوٹے ہوئے تیری امی کی دوا لیتا آؤں گا۔ اسٹو کی ٹوکم کر کے لڑکی گول ڈبے میں سے چھوٹے بڑے نوٹ نکالتی اور گنتی ہے پھر اس بوڑھے کی طرف بڑھا دیتی ہے۔

’لیجئے ابو!‘

جلدی سے توے سے آلیٹ اتارتی ہے۔

سلائس رکھنا بھول گئی تھی، رکھتی ہے، سینکتی ہے۔ آلیٹ کے ساتھ پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیتی ہے۔ میں نزدیک رکھے اپنے بیگ کو دیکھتا ہوں، زپ بند ہے۔

’آپا! سورو پئے دے دو، سنیما جانا ہے۔ آکس کریم بھی کھانی ہے۔ ایک لڑکا آکر لڑکی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔‘

’سنیما جانا ہے تو ایسے بول رہا ہے جیسے بڑی نوکری پر جانا ہو۔ کمانا دھانا نہیں ہے مگر آنکھوں کی عیاشی کے ساتھ زبان کا پنخارہ بھی برقرار رکھنا ہے۔‘ لڑکی نے تیزی سے کہا۔

’کرم جلی! کیوں گندے پیسوں کے لئے سونے جیسے بھائی کو آنکھ دکھا رہی ہے۔ اس بڑھے کو تو فوراً پیسے نکال کر دے دیتی ہے۔ وہ کون سا کماتا ہے؟ تمام دن سفید داڑھی میں دھول ڈالتا رہتا ہے۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی پانچ نمازوں کے علاوہ اسے کچھ اور سوچتا ہے اسے؟ یہاں بھلے ہی دوزخ میں زندگی گزار رہا ہے، وہاں اسے جنت چاہئے۔‘ کرخت آواز والی عورت چلا چلا کر بول رہی تھی۔

لڑکی مجھے چائے دیتی ہے۔

’آپا دیکھنا، ایک دن یہ ٹھیکرے ٹھا کرے چھوڑ کر تم میرے سیون اسٹار ہوٹل کی چکن بریانی کھاؤ گی۔‘

’ہوا میں تیر بھانجنا بند کر۔ بہت باتیں بناتا ہے۔ سارا دن جی توڑ محنت کرتی ہوں۔ لاٹری نہیں لگتی ہر روز۔‘

گلی میں سے زور زور سے کونے کونے کی آواز آتی ہے، ’ہائے اللہ! یہ کیسی زندگی ہے! اس کرم جلی کو بھائی پھوٹی آنکھ نہیں سہاتا ہے۔ یہ سب دیکھنے سے اچھا ہے کہ تو مجھے اپنے پاس بلا لے۔ کم سے کم اس دوزخ سے تو چھٹکارا ملے گا۔‘

’جلدی دو آپا، دیر ہو رہی ہے۔‘ لڑکا گول ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لڑکی درمیان ہی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ لڑکا زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر

ڈبے سے نوٹ نکالتا ہے اور بغیر گنے جیب کے حوالے کر دیتا ہے۔

’برا ہوگا، دیکھنا خواجہ، بہت برا ہوگا تیرا۔‘ دکھ کی ماری وہ رلائی روک نہیں پائی۔ مٹی کے تیل کا چراغ بھک بھک کر کے بجھ جاتا ہے۔ میں اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ پیسے دے کر بیگ لے کر گیٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا ہوں۔ بیگ رکھ کر کمرے میں اندر سے آٹو میٹک تالا لگا کر خود کو پلنگ پر پھینک دیتا ہوں۔ فوراً ہی آنکھ لگ جاتی ہے۔

آنکھ کھلتی ہے۔ رات کے نو بجے ہیں۔ آرام کافی ہوا۔ رقم کا حساب کروں۔ ہاتھ منہ دھوتا ہوں۔ تازہ دم ہو کر بیگ کھولتا ہوں۔ بل بک، رسید بک، سیمپل نکالتا ہوں۔ ایک ایک کر کے سب چیزیں نکال لیتا ہوں۔ اچانک چونک جاتا ہوں۔ لفافہ ندارد ہے۔ تمام چیزوں کا دوبارہ جائزہ لیتا ہوں۔ لفافہ نہیں ہے۔ میرے کان سرخ ہو گئے ہیں۔ رگوں میں خون اچھلنے لگتا ہے۔ بیگ میں ہاتھ ڈال کر میں نے کونا کونا کھنگال ڈالا، ٹول کر دیکھا کہ اسٹر تو پھٹا ہوا نہیں ہے، نہیں، لفافہ نہیں تھا۔ میرے سامنے امی کی لال، آنسوؤں سے بھری، رورو کر سو جی ہوئی آنکھیں گھوم گئیں، پاپا کا زرد چہرہ مجھے ڈرانے لگا۔ شاید میرا خود کا چہرہ بھی ویسا ہی ہو گیا تھا۔ فیوز بلب جیسا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سیمپل جھٹک کر دیکھے۔ بل بک، رسید بک بار بار جھٹکیں۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی لفافہ نہیں ہے تو نہیں ہے۔ میں رونے پر آ جاتا ہوں۔ سامنے آئینے میں میرا عکس نظر آ رہا ہے۔ مجھ سے بالکل مختلف۔ میں اپنے آپ کو نہیں پہچان پا رہا ہوں۔ آنکھیں، بال، ناک، میرا مکمل وجود مجھے اجنبی لگ رہا ہے۔ بدحواس حالت میں باہر نکلتا ہوں۔ یقیناً ہی ناشتہ کرتے ہوئے میرے ساتھ پٹی پر بیٹھے ہوئے شخص نے یہ کارنامہ انجام دیا ہوگا۔ اسی لئے وہ فوراً چلا گیا وہاں سے۔ کیا کروں؟ پولیس تھانے جاؤں؟ کیا ملے گا وہاں جا کر؟ یاد کرتا ہوں،

آخری مرتبہ میں نے لفافہ کو کب دیکھا تھا؟ سب یاد ہے۔ نوٹ ڈال کر، لفافہ سنبھال کر بیگ میں رکھا تھا۔ زپ بند تھی اور بیگ پورے وقت میرے ساتھ تھا۔ کہیں لاوارث نہیں چھوڑا تھا بیگ میں نے۔ وہ آدمی یقیناً جیب کترا، لچا، لفافہ رہا ہوگا۔ پیسے لے گیا۔ مجھے جیتے جی مار گیا۔ مجھ بے وقوف کو پتہ ہی نہیں چلا۔ سڑک پر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں، بے وقوفوں کا شہنشاہ ہوں، جیسے لاکھوں روپے چرانے کے بعد وہ وہیں اس علاقہ میں ٹہل رہا ہوگا۔ پھر بھی میں اس جگہ گیا



جہاں میں نے چائے پی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید وہ لڑکی اس آدمی کو پہچانتی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ اس کا روزانہ کا گراہک ہو۔ ہر روز چائے پینے آتا ہو۔ وہاں پہنچا، وہ جگہ سناں تھی جیسے خواب خرگوش میں ہو۔ اندھیرا تھا، چہوڑا خالی تھا، میں پتلی گلی میں گھستا ہوں۔ لڑکی کے ابو کے ہنسنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لڑکی نظر نہیں آرہی ہے۔ انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا، پوچھا، کیا چاہئے؟

’جی معاف کریں۔ آپ کی وہ لڑکی کہاں ہے؟‘
’کیا کام ہے؟‘ انہوں نے خوفناک لہجے میں پوچھا۔

’مجھے اس سے ایک گراہک کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔‘
’خاموش رہ بد معاش! کون سا گراہک؟ کس کا گراہک؟ بھاگ جا یہاں سے۔‘ ان کے الفاظ میں دھمکی تھی۔ مجھے احساس ہوا، اگر ایک اور منٹ میں یہاں کھڑا رہا تو وہ مجھے جہنم رسید کر دیں گے۔ میں گلی سے باہر نکل آیا۔

ختم! سب کچھ ختم ہو گیا۔ قرض، قرض اور صرف قرض رہ گیا جسے ادا کرتے کرتے عمر نکل جائے گی۔ پاپا کی طرح مجھے بھی کپڑے کی دکان میں نوکری کرنے پڑے گی۔ قدرت کا قانون توڑنے چلا تھا۔ بھول گیا تھا اولاد کو باپ کی وراثت سنبھالنی پڑتی ہے۔

’بابو جی! وہ چائے والی لڑکی تھی۔‘ مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ اس نے لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے محسوس ہوا میں ہوا میں پہنچ گیا ہوں۔ نہیں، میرے پاؤں تو زمین پر ہی ہیں۔ شاید میرے دل نے اونچی چھلانگ لگائی ہے۔ لفافہ ہاتھ میں لے کر میں نے اسے تولا۔ پیسے دے کر آپ جیسے ہی روانہ ہوئے، پٹی کے نیچے مجھے یہ لفافہ نظر آیا۔ طے تھا کہ آپ کا ہی ہوگا۔ آپ کے بعد وہاں کوئی اور نہیں بیٹھا تھا۔ میں لفافہ لے کر آپ کے پیچھے آئی تھی مگر آپ نظر نہیں آئے۔ لوٹ کر میں نے چہوڑا بڑھایا اور امی کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ سوچ کر آپ لفافہ ڈھونڈتے ہوئے ضرور آئیں گے۔ آخر چھوٹی رقم تو ہے نہیں۔ بس تھوڑی دیر کے لئے چہرے کے نیچے گئی تھی کہ آپ آ گئے۔ میں اسے دیکھتا رہا، صرف دیکھتا رہا۔ کچھ کہہ نہیں سکا۔ گویا پیدائشی گونگا تھا۔ اس کی کالی آنکھوں کی چمک اندھیرے میں بھی صاف نظر آرہی تھی۔

ہاسٹل کا ہاتھ روم



مصطفیٰ علی

ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

موبائل: 8896869738

ایک دن مولانا نے فضائل جنت پر لب کشائی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

”پیشاب پاخانہ وغیرہ دنیا کی مادی غذا کا غیر مفید جزو ہے۔ جنت کی غذاؤں میں کوئی ایسا جزو شامل نہیں ہوگا اس لیے وہ مکمل ہضم ہو کر جزو بدن بن جائے گی اور قضائے حاجت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جنتیوں کی ڈکار مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی یہ قضائے حاجت کے قائم مقام ہوگی اور ان کا پسینہ مشک کی خوشبو کی طرح ہوگا اور یہ پیشاب کے قائم مقام ہوگا۔“ اس بیان کو سن کر ہم نے دل ہی دل میں غالب کا یہ شعر گنگنا یا تھا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے کیونکہ ہمیں اس وقت جنت کی یہ فضیلت بالکل دو کوڑی کی معلوم ہوئی تھی مگر ایک دن ہم پر ایسا آن پڑا کہ ہمیں مرحوم چچا غالب اور ان کے اس شعر دونوں پر ہی لا حول پڑھنا پڑا اور جنت کی اس بظاہر ادنیٰ فضیلت کو اعلیٰ ترین فضیلت تسلیم کرنا پڑا۔

ذکر واقعہ سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ اس کم تر شوریدہ موج کا حلقہ یاراں بہت وسیع ہے، اس لیے اکثر و بیشتر خانہ خاکسار پر خوش گپیوں اور ادبی وغیر ادبی نشستوں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔ اس دن بھی ایسی ہی ایک نشست منعقد تھی۔ دوران جلسہ ہی مجھے شدت بول نے دبوچا تو میں نے سوچا کہ آداب محفل کا لحاظ رکھا جائے اور نشست برخاست ہونے سے پہلے ہاتھ روم

نہ جایا جائے، لہذا میں نے اسے دبائے رکھا پھر جیسے ہی احباب رخصت ہوئے میں فی الفور کمرے سے نکلا اور دروازہ تیزی سے بھیڑتے ہوئے بیت الخلاء کی جانب بھاگا۔ حیف! جس کا ڈر تھا وہی ہوا، اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک لمحہ گنوائے بغیر میں نے دوسرے ہاتھ روم کا رخ کیا وہ بھی دور سے بند نظر آیا پھر بھی تسلی دل کی خاطر میں نے قریب جا کر اسے جھٹکا دے کر دیکھا، میرا شک صحیح نکلا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ دارالاقامہ کے تیسرے منزلے پر جس طرف میری رہائش تھی اس طرف بس یہی دو عدد کھڑیاں تھیں۔

میں مضطرب کھڑا کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں، تبھی دفعتاً مجھے کچھ یاد آیا اور میرا چہرہ کھل اٹھا۔ میں فوراً نیچے کی طرف بھاگا۔ وہاں سات ہاتھ روم بالترتیب ہیں۔ میں نے پہلے ہاتھ روم کے دروازے پر زوردارات ماری اور اس کے ساتھ ہی اندر گھس گیا۔ ”او... دو... دو... دو... آک... تھو“ اندر کا منظر دیکھ کر طبیعت متلانے لگی۔ مگ پاخانے کی پیالی میں اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور غایط کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس غایط کے ذہیر پر لاتعداد مختلف النوع مسلح کیڑے اس طرح چکر لگا رہے تھے جیسے کسی قلعے کی نگرانی کر رہے ہوں۔ اس سے کچھ فاصلے پر کا کروچوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب آپس میں ایک دوسرے سے برسر پیکار پوری کھڑی میں باہا کار مچائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ طہارت خانہ نہیں بلکہ ان کا میدان کارزار ہو۔ یہ مشاہدہ میری طبیعت پر نہایت گراں گزرا۔ میں جتنی تیزی سے

اندر گیا تھا اتنی ہی تیزی سے باہر نکل آیا۔ پھر دوسرے ہاتھ روم کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کا دروازہ پھوپھو دیکھ کر دل کو راحت ملی۔ میں نے بلاتا خیر اس کو زور کا جھٹکا دیا۔

”ارے تری.... سالے.... اندھے....“ رک بتاؤ تھی۔ ”ٹوائٹ میں کوئی موجود تھا جس کی گالی سن کر میں ہڑبڑا گیا۔ اپنے کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: ”اندر سے بند نہیں کر سکتے تھے؟“ ”کنسے بند کرتے، کندی تہرے باپ کہن سے لیا۔“ اس نے بہت غصے میں جواب دیا۔

شدت بول سے میرا دم نکلا جا رہا تھا اس لیے میں نے اس سے الجھنا بے کار سمجھا، لہذا اسے بڑبڑاتا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ چیک کیا تو تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے ہاتھ روم کا دروازہ بند ملا البتہ ساتویں کا کھلا ہوا محسوس ہوا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اس مرتبہ بڑے احتیاط سے آہستہ آہستہ دروازے کا پٹ سرکایا۔ آہ! یہ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا کہ اس کے اندر نہ کوئی شخص موجود تھا اور نہ ہی کموڈ گندہ تھا۔ مانو میرے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ ویسے جب سے میں نے برطانوی اخبار ”ڈیلی میل“ میں آسٹریلیا کی سڈنی یونیورسٹی کے ماہر ”ونسینٹ ہو“ کی نئی تحقیق کی رپورٹ پڑھی ہے تب سے مغربی طرز کے ٹوائٹ میں رفع حاجت کرنا تقریباً ترک کر دیا ہے مگر مجبوری کا نام مہاتما گاندھی۔ میں نے جھٹ سے اندر داخل ہو کر سنگنی لگائی۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے میری نظر ٹوٹی پر پڑی تو میں

غصے سے بھوت ہو گیا۔ وہاں صرف ایک نٹ کسا ہوا تھا اور ٹوٹی نڈا دھکی، میں نے پائپ کو دبا کر چیک کیا وہ بھی ناکارآمد تھا۔ میں غم زدہ حالت میں وہاں سے نکل آیا۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے ناپاک ہونے سے بال بال بچا لیا۔ اب انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ اور کھڑیاں دور تھیں وہاں جانے کا مطلب تھا ”نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم“ کا مصداق بننا اور کیا پتہ ادھر بھی یہی منظر ہو اس لیے ایک طرف کھڑے ہو کر میں ان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

نہ پوچھو اس وقت میرے اوپر کیا گزر رہی تھی۔ انتظار کی ایک ایک گھڑی برسہا برس کے مترادف تھی۔ ان لمحوں کو جھیلنے میں مجھے جو تکلیف محسوس ہو رہی تھی اس کی شدت مجنوں کو لیلیٰ کے، فرہاد کو شیریں کے اور مرغیث کو بریرہ کے انتظار میں محسوس ہونے والی تکلیف کی شدت سے کسی طرح بھی کم نہیں رہی ہوگی۔ بادشاہ ہارون رشید نے رفع حاجت کی قیمت کیوں اپنی آدمی سلطنت بتائی تھی اور ہندوستان کی موجودہ حکومت ”شو چالیہ ابھیان“ کے تحت جگہ جگہ ٹوائٹ بنوانے پر اتنا زور کیوں دے رہی ہے یہ مجھے اس وقت اچھے سے سمجھ میں آ رہا تھا۔ آپ یقین جانیے صاحب! یہ اتنا نازک لمحہ ہوتا ہے کہ اس گھڑی منتظر شخص حضرت کھڑی نشین کو اول جلوس، الم علم کچھ بھی بک سکتا ہے۔ یہ تو خاکسار تھا کہ چونکہ بزرگوں میں بیٹھا بہت ہے اس لیے اب تک سراپا آداب بنا ہوا تھا ورنہ انشاء اور منتظر جیسا کوئی شوخ ہوتا تو جھلا کر کہہ دیا ہوتا ”اندر دہنت شاعر عالم۔“

پیشاب کی تیزی کے سبب اب میرا پیٹ بھی بڑبڑانے لگا تھا۔ حالات پر قابو پانے کے لیے میں نے دانتوں کو دانتوں پر جما کر بھیجنا شروع کیا، جس کی وجہ سے رخسار پھولنے پھٹنے اور منہ کی ساخت عجب طرح کی بن جاتی۔ جب یہ نسخہ کارگر نہ ہوا تو میں آگے پیچھے کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک جگہ کھڑے ہو کر

میں نے پیروں کی اٹھا پٹک شروع کر دی پھر ایک ہاتھ کی انگلی دوسرے سے بجانے لگا۔ ایک مرتبہ بجاتے ہوئے بے خیالی میں میری انگلی اتنی پر زور طریقے سے دب گئی کہ اس کی تکلیف سے میں بلبلاتا اٹھا۔ کچھ دیر میں ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا رہا پھر بھی بات نہ بنی تو بالآخر میں نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

”نہ جانے اندر کیا کرنے لگتے ہیں کم بخت۔ ہاتھ روم میں داخلہ کیا مل گیا مانوں سکندر کی سلطنت مل گئی۔ سیٹ پر ایسے جم کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے شاہجہاں کے تخت طاؤس پر براہمان ہو گئے ہوں۔ دنیا و ما فیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں خار پست۔ ناہنجاروں کو اس کی بو میں مشک کی خوشبو کا مزہ ملتا ہے تبھی تو اس میں پہنچتے ہی خوابوں کی وادیوں میں سیر کرنے لگتے ہیں۔ معشوق کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ کچھ نالائق تو اسی میں اپنا سبق یاد کرنے لگتے ہیں اور شاعر مزاج حضرات کا تو پوچھئے مت، اس میں بیٹھتے ہی ان پر اشعار کا الہام ہونے لگتا ہے۔ وکلا صاحبان کو تو اس میں تشریف لاتے ہی اپنے پیچیدہ مقدمات کی تدبیر سو جھنکے لگتی ہے۔ سائنس دانوں پر اس میں آتے ہی غور و فکر کے یلغار ہونے لگتی ہے لہذا جب تک وہ اپنے اگلے منصوبے ترتیب نہ دے لیں بھلا کیسے نکل سکتے ہیں۔ موسیقار ٹٹی کی دھن میں کھو کر اپنی نئی دھن تلاشے لگتا ہے اور گلوکار صوت گوز کے مد و جز میں محو ہو کر نیا سر نئی لے بنانے لگتا ہے۔ مصور بول و براز کے رنگ و روپ میں ڈوب کر کوئی انوکھا پیکر ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ چور کو بیت الخلاء کی خلوت اتنی راس آتی ہے کہ وہ چوری کے نئے نئے ہتھکنڈے اپنے ذہن میں ایجاد کرنے لگتا ہے اور کچھ لوگوں کا کیا کہنا! کھڑی کی ہاٹ سیٹ پر تشریف رکھتے ہی سیاسی داؤ بیچ کا ایسا سیلاب ان کے دماغوں میں اٹھتا ہے کہ وہ وہی بیٹھے بیٹھے ملک کی قسمت کا فیصلہ تک کر ڈالتے ہیں۔ اب بھلا انھیں کون سمجھائے، سبھی تو اپنے مغلق مسائل لے کر اس میں

بیٹھ جاتے ہیں اور باہر نمبر پر کھڑے شخص کا کسی کو ذرا سا بھی خیال نہیں رہتا۔“

جب انتظار حد سے تجاوز کر گیا تو صبر نے میرا ساتھ چھوڑ دیا لہذا میں نے دروازہ پینا شروع کیا۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اب مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں دروازہ اندر سے بند نہ ہو کیونکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ شرارتی بچے اندر سے ہاتھ روم کی کنڈی لگاتے ہیں پھر اس کے دیوار اور چھت کے درمیان پڑی کھالی جگہ سے کود کر بھاگ جاتے ہیں۔ ادھر لوگ قطار پر قطار لگائے کھڑے رہتے ہیں۔ گھنٹوں بعد انکشاف ہوتا ہے کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں نے دروازہ بھڑبھڑانے کے ساتھ اب آواز لگانا بھی شروع کر دی ”ارے کون ہو بھائی، جلدی باہر نکلو، کتنی دیر لگاؤ گے، اوروں کو بھی موقع دو۔“ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ اب تو میرا شبہ یقین میں بدلنے لگا۔ دلاسہ دل کی خاطر میں نے سوچا کیوں نہ اندر جھانک کر دیکھ لوں۔ میں نے ہاتھ روم کی دیوار کے سہارے اوپر چڑھنا شروع کیا لیکن تبھی کسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی، کوئی ہاتھ روم کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے اپنا عمل شرافت کے خلاف لگا اس لیے جہاں تک پہنچا تھا وہیں سے چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا اور من ہی من سوچنے لگا کہ

”شہر سے اچھا تو گاؤں، دیہات ہے کہ تیل یا موبل کے کسی خالی ڈبے میں پانی بھر لو اور کسی کھیت یا میدان میں جھاڑا پھرنے چلے جاؤ۔ اگر کسی وجہ سے پانی ساتھ لے کر نہیں جا سکے یا گھاس پھوس کی حرکت سے وہ خدا نخواستہ گر جائے پھر بھی کوئی دقت نہیں، نہر، ٹیوب ویل، پمپ سیٹ، پوکھرا یا تال تلیا کچھ نہ کچھ تو کھیت کے قریب مل ہی جاتا ہے۔ ننھے کے بعد آدھا پینٹ اٹھا کرو ہاں پہنچ جاؤ اور پانی چھولو۔“

ہائے رے قسمت! ابھی تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے مزید انتظار کرنا کرنا کار فضول سمجھا۔ میں پھر بدحواس سا اوپر کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر ذرا

تھہرا پھر اپنے پھولے ہوئے سانس کو قابو میں کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے دونوں ہاتھ روموں پر نگاہ ڈالی، دونوں کے دروازے اب بھی بند تھے۔ اب میرا پارا گرم ہو گیا تھا۔ میں کبھی سر کھجاتا، کبھی انگلیاں پھوڑتا، کبھی پیروں کی اٹھا پٹک کرتا، کبھی دانتوں کو پیٹتا اور کبھی بے اختیار آگے پیچھے کرنے لگتا۔ اس حالت میں کبھی منہ بدلاتا تو کبھی پیٹ گزرتا اور کبھی دونوں ہم نوا ہو جاتے۔

”کیا کر رہے ہو بھائی، بہت مینسن میں لگ رہے ہو۔“ اچانک ادھر سلیم بھائی آ دھمکے تھے اور انھوں نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”کیا بتاؤں استاد، دنیا میں ہر روز کوئی نہ کوئی مر رہا ہے مینسن تو رہے گا ہی۔“

”ارے واہ! یہ تو وہی بات ہو گئی کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔“

”بابا بابا۔۔۔“ دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

”بھڑ بھڑ۔۔۔ پڑ پڑ۔۔۔ بھڑاک۔“

”بابا بابا بابا۔۔۔“ ہاتھ روم سے اچانک آئی اس غیبی آواز نے ہم دونوں کی تیز ہنسی کو چند لمحے کا وقفہ دے کر تیز کر دیا۔ سلیم بھائی بھی بہت مرنجیاں مرنج آدمی ہیں۔ وہ جاتے جاتے موقع کی مناسبت سے یہ شعر سناتے گئی۔ ملاحظہ فرمائیں:

بیت الخلاء سے آئی آواز با ترنم
شاید کوئی حسینہ جھپٹش میں مبتلا ہے
میری آنکھوں کے سامنے اب تارے ٹمٹمانے
لگے تھے اور تاریکی سی چھانے لگی تھی۔ میرے دماغ کا ڈولج بھی بہت ہائی ہو گیا تھا۔ اب تو مجھے جاضرور خطا ہونے کا ڈر بھی ستانے لگا تھا۔ میں تیز قدموں سے چل کر داہنی طرف والے ہاتھ روم کے پاس پہنچا اور اس کا دروازہ اتنی زور سے کھٹکھٹایا جیسے وہ ہاتھ روم کا دروازہ نہیں بلکہ مندر کا گھنڈہ ہو۔ دفعتاً دروازہ کھل گیا۔ میری روح کو تسکین ملی۔ میں نے سوچا نکلنے والا مجھ پر غصہ ہوگا لیکن اس نے

میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر تبسم کیا اور چل دیا۔ میں نے چین کا سانس لیا اور اندر گھس گیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بیچانے کا ظرف آب و غلاظت کے گھول سے پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ وہاں ایک سیکنڈ بھی رکنا میرے لیے دشوار تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بائیں ہاتھ روم کی جانب روانہ ہوا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس کے دروازے کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔

”آ آ آ آ۔۔۔“

اندر کوئی موجود تھا جو کندی کھول کر شاید نکلے ہی والا تھا کہ میرے ناگہانی دھکے سے زمین پر دھراشائی ہو گیا۔ میں بھی چونکہ حالات سے بے خبر تھا اس لیے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ میں نے فوراً اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑے اور چوٹ بھلا کر پہلے کھنڈی کی طرف دیکھا۔ اس پر گاڑھے کالے، پیلے داغ کائی کی طرح جمے ہوئے تھے۔ میں نے اس وقت اسی کو غنیمت جانا۔ اندر گرا ہوا شخص اب اٹھ چکا تھا۔ وہ مجھ پر بہت خفا تھا۔ میں نے کسی طرح منت سماجت کر کے اسے باہر نکالا اور سنگنی لگا کر قدمچہ پر بیٹھ گیا۔ موسم تو پہلے سے ہی بنا ہوا تھا اس لیے کوئی تنہا نہیں پڑا۔ پہلے دروازہ پھر فوراً پیٹ میں اٹینٹھن ہوئی اور دھڑ سے بیچانہ ہوا۔ اسی بیچ میری نگاہ سامنے کی دیوار پر پڑی، جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا ”دائیں دیکھو۔“ میں نے دائیں دیکھا تو مرقوم تھا ”بائیں دیکھو۔“ بائیں جانب نگاہ ڈالی تو تحریر تھی ”پیچھے دیکھو۔“ اور جب پیچھے دیکھا تو وہاں شاہکار اعضاء کی ایسی تصویری نمائش موجود تھی اور ایسے ایسے اقوال و علوم منفش تھے کہ اللہ کی پناہ۔ میں تو اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس دیوار پر کسی مجنوں نے اپنے دل کے پھپھو لے بھی پھوڑے ہوئے تھے اور کسی دل جلے کے دلی ارماں بھی اس پر خوبصورتی سے بہہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں اس دیوار پر

مزین تھیں جن کا بیان خلاف آداب سمجھا جائیگا۔ بس اتنا جان لیجیے کہ اگر بچے اس کا مشاہدہ کر لیں تو وقت سے پہلے جوان ہو جائیں۔ ان تحاریروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر یہ قوم اپنی تخلیقی مہارت تہذیبی سانچے میں ڈھال کر دیواروں سے باہر لاتی تو کتنی ترقی کر جاتی لیکن افسوس کہ یہ قوم ابھی تک دیواروں کی تہذیب بھی نہیں سیکھ پائی۔

ہاتھ روم کی دیوار سے یاد آیا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر تھے ”شہر یار“۔ جن دنوں فلم ”امراؤ جان“ کے لیے لکھے گئے ان کے نغمے زبانزد خاص و عام تھے۔ انھیں دنوں انھیں ضعیف مثانہ کی بیماری لاحق ہو گئی تھی جس کی وجہ سے انھیں بار بار ہاتھ روم جانا پڑتا تھا۔ انھیں نغموں سے درج ذیل شعر کسی شرارتی بچے نے منتخب کر کے ان کے ہاتھ روم کی دیوار پر لکھ دیا تھا۔

اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجیے

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے شعر کا ایسا بر محل استعمال خود ان کا مذاق بنانے کے لیے کبھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کی پر اس طالب علم کو نہیں جان پائے۔ اس شرارت پر یک گونہ سا قلق انھیں مرتے دم تک رہا۔ حاجت رفع کرنے کے بعد میں نے ٹوٹی گھمائی۔ وہ نہیں گھمی۔ میں نے پھر ذرا سختی سے گھمائی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تیسری مرتبہ میں نے پورے دم خیم کے ساتھ کوشش کی تو ٹوٹی نکل کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے نکلنے کے ساتھ ہی وہاں سے پانی کی ایسی تیز و تند دھارا رواں ہوئی کہ میں اپنے آپ کو بچا نہ سکا اور پوری طرح گیلا ہو گیا۔ میں بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا، سنگنی سرکائی اور سر لٹکائے دل میں یہ ارمان سجائے اپنے کمرے کی طرف چل دیا کہ ”کاش! میں چارلس ڈکنس کی ہیروئین ہوتا تو یہ دن نہ دیکھتا۔“

□□□

فلکشن کی کتابیں محض ساڑھے دس فیصدی...!!

ادارہ نیادور کو گزشتہ تقریباً ایک سال سے زیادہ کے عرصہ میں ۱۶۱ کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے قطعی حیرت نہیں ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کتابیں تنقیدی نوعیت کی اور شعراء کے مجموعے ہیں۔ محض ۱۵-۱۶ کتابیں ہیں جو فلکشن سے تعلق رکھتی ہیں۔

کر لیا ان میں تقریباً تمام شاعر نہیں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہم اردو والوں میں ابھی تک شاعری کے تئیں ہماری عقیدت باقی ہے لیکن فلکشن کو اس قدر نظر انداز کرنا کسی بھی حد تک ادب کے لئے سودمند نہیں کہا جاسکتا۔

تعارف اور چار نمائندہ افسانوی مجموعے/ناول پر تبصرے شائع کر رہے ہیں۔

’بچہ عی کا مچھرا‘ صادقہ نواب کا سحر کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اسی سال شائع ہونے والے اس مجموعہ میں ۱۳ افسانے شامل ہیں۔ صادقہ نواب سحر کا اسلوب داستان گوئی سے کافی حد تک متاثر نظر آتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں قدرت کے حسین مناظر سے لے کر کرداروں کی معنویت کے ساتھ ساتھ کہانی

اردو فلکشن کے زندہ و جاوید کردار امراؤ جان آدا کی Re Discovery ’خواب سراب‘ نامی ناول کے صفحات کی خصوصیت ہے اور ناول نگار ہیں انیس اشفاق۔ یہ ان کا دوسرا ناول ہے۔ اردو میں Fact-Fiction کو بھی ابھی تک قبولیت کی سند حاصل نہیں ہو پائی ہے تو کسی کردار کی Re Discovery کے بارے میں تصور کرنا ذرا مشکل ہے لیکن انیس اشفاق نے یہ جو حکم مول لیا اور انگریزی ادب کی طرز پر جہاں ایک ایک کردار پر کئی کئی قلم کار اپنی تخلیقات رقم کرتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر انہوں نے ان گلیوں اور حویلیوں کی خاک چھانی جہاں امراؤ جان آدا سے متعلق واقعات تھیں، لکھنؤ کے چوک میں رہتی تھیں، رسوا نے ایک کردار گڑھا، انیس اشفاق نے ہے۔ ’بزازے سے چوک کی طرف آنے حسین کا پھانک تھا، یہیں تھا ان کا پردہ ناول لکھے اور پہلے میں سب کچھ صحیح لکھا جان کی کوئی اولاد تھی۔ یہ بات بھی ان کے چھوٹے تھے تو جس خوبصورت بزرگ جان تھیں۔ یہ پورا ناول چوک، گول کوچہ میر انیس، چاول والی گلی سے لے کر اکبری گیٹ تک کے ارد گرد پھیلا ہے۔ قدیم لکھنؤ کے ان علاقوں اور کرداروں کے مکالمے، جزئیات نگاری اور کرداروں میں وہ فضا، وہ خوشبو اور وہ تاثر جو قدیم لکھنؤ کا خاصہ ہوا کرتا تھا، سب کچھ موجود ہے اور وہ بلباس بھی جو گزشتہ لکھنؤ کی فخریہ شاخت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ ’خواب سراب‘ کئی معنی میں اردو فلکشن میں زبردست اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی مخصوص زبان اور لکھنوی محاوروں کے لئے ہی اس ناول کو پڑھا جانا اپنے آپ میں ایک contributory تجربہ اور معلوماتی اضافہ ہے۔ امراؤ جان آدا جیسے لافانی کردار پر انیس اشفاق کا یہ ناول نئی نسل کے اردو اسکالرس کے لئے مشعل راہ بھی بنے گا۔



یہ اعداد و شمار اردو ادب کے اس چلن اور ٹرینڈ کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اردو میں آج بھی شاعری کو جو اعلیٰ درجہ عطا کر دیا گیا ہے، فلکشن اس سے ابھی بہت دور ہے۔ نفسی تو غزل کی بنیادی خوبی مانی ہی جاتی ہے لیکن جب سے گائیکی نے غزل کو گلے لگا لیا تب سے ایسے شعراء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے جن کی نگاہ پردہ سیمیں پر زیادہ اور ادب پر کم ہے۔ دعویٰ تو یہ بھی ہے کہ

اردو میں تنقید بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر کسی بھی ریسرچ اسکالر سے لے کر کوئی بھی معتبر ادیب و شاعر قلم اٹھالیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں یہ دبا اتنی عام نہیں ہے۔

جون ۲۰۱۸ء کے شمارے میں ہم نے منتخب کے پس منظر کی سوندھی خوشبو بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی ایک کہانی کا عنوان ’الوکا پٹھا‘ بھی ہے جس میں آج کل کے تعلیمی اداروں میں نظام تعلیم اور تہذیبی بحران کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

شاعری Celebrity کا درجہ حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ خام خیالی صرف اردو تک محدود ہے۔ ہندوستان ہی میں ارون دھتی رائے، وکرم سیٹھ اور جیمپا لاہری جیسے Celebrity شاعر نہیں ہیں اور عالمی سطح پر جتنے بھی تخلیق کاروں نے Celebreties کا درجہ حاصل

ہونے والے وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں یہ سب کچھ اس نہیں آتا خاص طور سے وہاں جہاں تہذیب و تعلیم کی تربیت کی جاتی ہے۔ صادقہ نواب سحر نے اپنے افسانوں میں کچھ ایسے نسوانی کرداروں کو بھی بڑے سلیقہ سے گڑھا ہے۔ یہ کردار آج کے دور کی وہ شوخ لڑکیاں ہیں جنہیں اپنی دیرینہ روایات سے بہت زیادہ انسیت نہیں ہے لیکن جنہیں دور حاضر کے دنیاوی معاملات پر بڑی زبردست مہارت حاصل ہے، اور

شاید یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔ اپنے تمام افسانوں میں صادقہ نواب سحر قاری کو کہانی آخر تک پڑھنے کے لئے باندھے رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

علاقائی زبانوں کی کہانیاں ڈاکٹر بانو سرتاج کی یہ ایک بیحد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل زبانوں کی کہانیوں کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ انتساب شری پت رائے جی (فرزند منشی پریم چند)

کے نام ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج فی الوقت ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں جو بیک وقت اردو، ہندی اور مراٹھی زبانوں میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ مشمولہ زبانوں کی کہانیوں کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ ہر کہانی متاثر کرتی ہے۔ ہر کہانی اپنے اپنے علاقائی رنگ اور روپ سے

بھرپور ہے۔ ان کی کہانیوں میں روزمرہ کی زندگی کے کھٹے میٹھے، تیکھے، کڑوے اور کیسلے تجربات علاقائی عصبيت کے ساتھ شامل نظر آتے ہیں۔ مقدمہ میں ڈاکٹر بانو سرتاج نے حقیقت بیانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ کتاب میں درج کہانیوں میں سے ہندی اور مراٹھی کہانیوں کے ترجمے براہ راست انہیں زبانوں سے کئے گئے ہیں جب کہ بقیہ تمام کہانیاں ہندی سے ترجمہ شدہ ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے

افسانوں میں عورت کی جنسی نفسیات کو مرکزی علامت بنا کر بیحد کامیاب افسانے اور ناول لکھ کر مشہور ہوئے شموئل احمد کا ناول **گرداب** گزشتہ سال شائع ہوا۔ ناول کے پہلے صفحے پر ہی ستاروں کو ڈھونڈنے کی سعی اور نسوانی حسن کے خدو خال کے پر اسرار بیان سے ان کے اس ناول کی کامیابی بھی نظر آ جاتی ہے۔ عورت کے جسم کے حصوں کے زمزمے اور ہمہ کی تاویل کو ہندو دیو مالا، زانچہ شناسی اور میروکارڈ کی پیٹنگوٹی سے منسلک کرنے کا فن اردو ادب میں غالباً اگر کسی کے پاس ہے تو وہ شموئل احمد ہی ہیں۔ 'سنگاردان' جیسی شہرہ آفاق کہانی کے خالق شموئل احمد کے ریا کاریوں پر مرد کی اجارہ داری کا کرداروں کے نام زانچے کے خانوں کے کرداروں میں پائل کی چم چم، گیسوؤں عورت کی چھاتیوں کے کساؤ اور اس کے کہیں مرد نظر آتا ہے، یا تو وہ احمق، ڈھک یا ہے، اور عاشق تمام تر درجات سے بالا کی عورت پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے اور مستفیض ہو سکتا ہے، شموئل احمد نے بخوبی خلوص سے بڑھ کر کوئی خلوص نہیں اور 'کیا شموئل احمد اس طرح کے ڈھیروں معنی زانچہ شناسی کے توسط سے بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول میں انہوں نے کچھ ہندو دیوتاؤں کے بارے میں جو اطلاعات افسانوی انداز میں بیان کر دی ہیں، وہ اردو ادب میں ایک بڑا اضافہ کبھی نہ کبھی ضرور تسلیم کیا جائے گا۔ شموئل کی گفتار کا اثر بھی ناول کے تقریباً ہر صفحات پر صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان کے تمام افسانوں اور ناولوں میں بہار کی شہری زندگی سے لے کر مضافات کی مخصوص مٹی کا سوندھا پن بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی بہترین کہانی 'سنگاردان' کئی ملکی وغیرہ ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔



کتاب میں شامل ہیں۔ راجیو پرکاش ساحر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سائنسی معاملات کو بھی اپنے افسانوی فن میں ڈھالنے کے ماہر ہیں۔

ان کے افسانے اس معاملے میں سب سے منفرد ہیں کہ ان کے یہاں سائنسی تجربات، ایجادات اور اس سے ہونے والے خاطر خواہ فائدے اور نقصانات پر ان کے کردار بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'خلائی موسیقی' ان کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں سات آسمانوں اور خلاء کی پر اسراریت کا بیان ماں بیٹی کے درمیان خلائ کی پرواز کو لے کر جو بحث و مباحثہ ہو رہا ہے اور آفتاب کے جاہ و جلال اور ماہتاب کی شینہ چاندنی سے لے کر مرتخ، زہرہ، عطارد، مشتری وغیرہ کی خلاؤں میں چال بازیوں کے انوکھے طلم پر افسانوی پیراہن میں بڑی خوبی سے گفتگو کی گئی ہے۔

ان کے دوسرے افسانوں میں بھی اسی قسم کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ زبان ہندی زدہ ضرور ہے لیکن گراں ذرا کم ہی گزرتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالرشپینہ بیگم کا ناول 'خلش' گزشتہ سال کی اشاعت ہے جس پر کئی تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سفینہ کی تحریر پختہ اور

سے تعلق رکھتی ہے۔ راجیو پرکاش ساحر کا افسانوی مجموعہ **سپیلیں** اسی سال شائع ہوا ہے جس میں ان کے گیارہ افسانے شامل ہیں۔ کتاب دیدہ زیب ہے، اس کے علاوہ ان کے افسانوں پر چار تاثراتی مضامین بھی اس

رواں ہے۔ 'خلش' میں وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں اس کی ترسیل میں کوئی خارجی علت حائل نہیں ہوتی اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ پلاٹ، کردار اور مکالموں سے لے کر بیان تک کئی مرتبہ ایسے مناظر آئے ہیں جن کی دلچسپ روداد اور کردار نگاری قاری کو متاثر کرتی ہے۔

'خلش' چار لڑکیاں جو مختلف لیکن روایتی ماحول میں پرورش پاتی ہیں، ان کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کے تانے بانے سے بنا گیا وہ معاشراتی ناول ہے جس

زبان میں کیا ہے۔

'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' زبان کے اعتبار سے بھی متاثر کرتا ہے اور کردار اور مکالمے بھی بہتر ہیں۔ خطہ پنجاب کے پس منظر کی اس کہانی میں کافی کچھ ایسا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ منظر کشی کے اعتبار سے بھی اس ناول کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کائنات، جنس اور مرد و عورت کی جسمانی تبدیلیوں پر رینو بہل نے جس عالمانہ ڈھنگ

کرتا ہے تو اسے کن مشکلات اور تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ شکھا بن جاتا ہے۔ LGBT کو جب ترقی یافتہ ممالک کی طرز پر ہندوستان میں بھی قانونی حیثیت حاصل ہوئی تب رینو بہل کے اس ناول کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ انہوں نے اس بات کو بڑے عمدہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ اپنی فطری جنس کے برخلاف رویہ سماج میں ابھی بھی کس قدر ناقابل قبول ہے اور نہ صرف ناقابل قبول ہے بلکہ تضحیک کا

میں واقعات کی ترتیب اور کرداروں کی پیشکش ایک دم فطری محسوس ہوتی ہے۔ طوبی اپنی تمام فکری پیچیدگیوں کو اس طرح بیان کرتی نظر آتی ہے گویا کہ وہ ہم سب کی زندگی کی پیچیدگیاں ہیں۔ سفینہ کے اس ناول میں بار بار محسوس کرایا گیا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی اس مرد اساس معاشرے میں عورت کو اپنی خواہشات کا خون کرنا پڑ رہا ہے۔

اسرار گاندھی اردو افسانے کا معتبر نام ہے۔ 'ایک جھوٹی کہانی کا ج' ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ بنت، ہیئت، نفس مضمون، واقعے کی تحلیل نفسی، نفس الامر میں اس کا وجود، اسلوب بیاں، غیر معروف جزئیات کا عرفی حیثیت سے بیان، مختصر لفظوں میں بڑی بات کہہ جانے کا فن اسرار گاندھی کو بخوبی آتا ہے۔ وہ جمادات کو بھی آمادہ اظہار خیال کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں بولتی ہیں کہ انہوں نے زندگی کو لگتا ہے کہ زندگی ان کا ہاتھ تھام کر چل رہی بھی ہے۔ "کہرے سے ڈھکی ایک رات" شہروں کی آلودگی، اس کی فضا پر جمی کثافت اپنا وجود ہی انسان کو اجنبی لگے اور وہ اپنے کے افسانے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ انداز کر دئے جانے والے موضوعات کو مجموعہ کی ایک اور خصوصیات ان کا تین دعویٰ کیا ہے کہ ان کی کہانیاں قاری سے مدد کریں گی۔



بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا ہے اور کہیں کہیں اس نے ان سے پوچھا زندگی کے ایک ایسے ہی رنگ کی کہانی ہے۔ کی تھیں اور اداس ہوا میں۔ اندھیرا ایسا کہ ہی بیوے سے ڈر جائے۔ اسرار گاندھی انھوں نے چھوٹے چھوٹے اور بالعموم نظر بڑی خلاقی سے مباحثہ تک پہنچا دیا ہے۔ سطر انتساب بھی ہے جس میں انہوں نے مکالمہ کریں گی اور کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنے میں

اسرار گاندھی وہ افسانہ نگار ہیں جو جدید دور کے تمام تقاضوں اور معاملات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور اپنے افسانوں میں ان کرداروں کے ذریعہ وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جسے کہنے کے لئے سیکڑوں صفحات درکار ہوتے ہیں۔ بظاہر ان کے افسانوں کی زبان سادہ ہے لیکن اسی میں زندگی کی پیچیدگیوں اور معمول کو آسانی سے حل کرتے ہوئے اس خوبصورتی سے گزر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اداسی کا عنصر بار بار کسی نہ کسی روپ میں ضرور نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے گو کہ یہ جدید دور کی زندگی کا لازمی جز بن کر ہم سب کے سامنے آچکا ہے۔ اسرار گاندھی نے اس بیماری عام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کے سفر کو اپنے افسانوں میں بڑے عمدہ ڈھنگ سے مکالموں میں پرو دیا ہے۔

سبب بھی ہے۔ ہمارے یہاں ایسے افراد جو پورے طور سے نہ مرد ہیں اور نہ عورت، ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا ہے جب کہ درحقیقت اس میں ان کی کوئی خطا نہیں ہوتی۔ جو بھی ہوتا ہے سب کچھ فطری ہی تو ہوتا ہے۔ رینو بہل اس ناول کے عنوان 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' سے ہی ان افراد کے درد کو بیان کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔

'مہول' تنویر اختر رومانی کے افسانوں کا مجموعہ

ہے۔ مجموعہ میں ۲۰ افسانے شامل ہیں۔ یوں تو انہیں زندگی کی سچائیوں کو افسانہ بنانے والا فنکار کہا گیا ہے لیکن دراصل وہ اپنی کہانیوں میں ان کرداروں کے توسط سے بہار اور جھار کھنڈ کے علاقوں کی خصوصیات اور وہاں کی رسم و رواج کا بدرجہ اتم احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔

سے اپنی بات کرداروں کے ذریعہ رکھی ہے، اس کی تعریف نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ناول کی کہانی ایک متوسط گھرانے کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک لڑکا سات آٹھ برس کی عمر میں جب اپنے جنس کے برعکس گفتگو اور حرکات و سکنات شروع

'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' گزشتہ سال شائع ہوا جس نے حلقہ ارباب و سخن کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس سے قبل ان کے دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انہوں نے ہندی اور پنجابی زبانوں کی کئی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو

ان کے کئی کردار وہ سب بیان کرتے ہیں جن میں سماج کا درد و کرب تو شامل ہے ہی، فرسودہ روایات کے نتیجہ کے طور پر برداشت کیا جانے والا سچ بھی سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں وہ اردو ذرا کم نظر آتی ہے جس کے ہم سب عادی ہیں، ان کی زبان ہندی آمیز الفاظ سے مزین ہے۔ ان کا مجموعہ ان کے اب تک کے افسانوی سفر کا انتخاب کہا جاسکتا ہے۔

ایچ ایم یسین افسانوی دنیا کا غیر معروف سامان

اس کے پس پردہ زیادہ ہے۔ اختر کاظمی کا افسانوی مجموعہ 'سراب زندگی' اسی سال شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کے ۲۰ افسانے شامل ہیں۔ تنہائی کا کرب، زندگی کی پیچیدگیاں، رشتوں کی باریکیاں، سماج میں رائج رسم و رواج کے پوشیدہ مسائل کے علاوہ سرکاری نظام کی خامیوں کا بخوبی ذکر ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں میں معمولی آدمی سے لے کر حکومت کے بڑے کارندوں تک شامل

ان کے افسانے 'کیا نام دوں' میں فرقہ واریت اور اس کے پس پردہ جہالت کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ 'لہو پکارے گا آستیں کا' ایسا احساس کراتا ہے کہ جیسے کسی فلم کا کوئی منظر۔ زبان تخلیقی ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ ہے۔

'مکھرے کا چاند' نعیم کوثر کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اسی سال شائع ہوا ہے، جس میں ۱۴ افسانے شامل ہیں۔ نعیم کوثر میں افسانہ نگاری کا فطری رنگ نظر

ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'میں نے تو کہا تھا' میں کل ۱۷ افسانے شامل ہیں۔ وہ خود ایک بڑے تعلیمی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں اور کافی عرصہ تک مختلف سرکاری دفاتروں کے علاوہ ایک ایئر لائنس سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ افسانے معلوماتی زیادہ ہیں جو اکثر افسانے کم حقیقت زیادہ نظر آتے ہیں۔

اپنے افسانوں میں انہوں نے ہوائی پروازوں کی کمپنیوں

میں کام کرنے والے ملازمین کی زندگی سے تعلق رکھنے والے احساسات و مشکلات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے تکنیکی معاملات کو بھی شامل کر لیا ہے جس کی مثال اردو ادب میں کمیاب ہے۔ انداز بیان کبھی خطیبانہ بھی ہوا ہے لیکن اکثر معاملات اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش

احمد حسنین جانوروں اور جنگل میں ان کے شکار کی حیرت انگیز کہانیوں کے خالق ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'شکار اور شکاری' خاصہ دلچسپ اور جنگل کی پراسراریت سے بھرپور ہے۔ اس مجموعے میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں اور تقریباً سبھی کے عنوان جانور، شکاری اور جنگلات کے اسرار و رموز پر مبنی ہیں۔ مثلاً کالا ڈھونگ کا آدم خورشیر، تاج پور کا پاگل ہاتھی، آدھی رات کے پراسرار شکاری، لال کنویں کا آدم خور چیتا، دم کنا بھیڑیا وغیرہ۔ شکاریات پر اردو میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ شاید اسی لئے اسے اردو میں اس موضوع پر باقاعدہ طور پر پہلی کتاب کہا جا رہا ہے۔ مشاہدے کی عکاس ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ وہ سب ان کے ذاتی تجربے ہیں۔ شکار کے موڑ، شکار کے وقت، شکاری کی سیر آزما ہونے کی صورتیں اور پھر حیرت انگیز ہیں۔



یہ کہانیاں محض قصہ نہیں بلکہ ان پر کہانیاں مثلاً دم کنا بھیڑیا تو شاید بہتوں کو ایسے ماحول میں جب عشق و محبت، آپسی افسانوں اور ناولوں کے پسندیدہ موضوعات بن چکے ہیں، 'شکار اور شکاری' اپنے انوکھے اور ڈراؤنے پن سے بہت متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے ان کہانیوں کے بہانے جنگلوں کی تباہی اور بربادی کا بھی بخوبی ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ماحولیات کے معاملے میں ہم خواہ مخواہ محض اپنے تجسس کے تحت قدرتی وسائل کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سے قبل احمد حسنین کا ایک اور مجموعہ 'روشنی اور سائے' بھی شائع ہو چکا ہے جو خیالی واقعات پر مبنی تھا جب کہ یہ مجموعہ حقیقی واقعات پر۔ جنگل کے ہولناک واقعات اور درندگی کو انہوں نے جس خوش اسلوبی سے ادب کا حصہ بنا دیا ہے وہ انہیں کا خاصہ ہے۔

ہیں۔ ان کے اس مجموعے میں کہا گیا ہے کہ وہ ادب اس لئے نہیں تخلیق کر رہے ہیں کہ انہیں ایک بڑا فنکار تصور کیا جائے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک سچے خادم ادب ہیں۔ ان کے پاس اپنی بات کہنے کا سلیقہ ہے اور افسانے کے فن سے کما حقہ واقفیت بھی ہے۔

آتا ہے۔ مختلف موضوعات کی ان کے ان افسانوں میں ذہنی کشش، جس زندہ ماحول، مہنگائی، فسادات، خواہشات کے علاوہ دور جدید کی زندگی جس میں حقیقت کم نمائش زیادہ ہے، کا بڑے عمدہ ڈھنگ سے بیان ملتا ہے۔ انسان کس قدر لاچار و مجبور ہو چکا ہے، ان کے افسانوں میں مختلف مقامات پر نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے تجریدی رنگ لئے ہوئے بھی ہیں۔ اختصار میں کشادگی اور

پیرائے اظہار میں جذبات کو نپے تلے الفاظ میں سجادینا ان کا خاصہ کہا جاسکتا ہے۔ مدھیہ پردیش کی علاقائی موسیقیت اور ترنم کے ساتھ وہاں کی نفسی کو بھی ان کے افسانوں میں محسوس کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔

● سہیل وحید

نیا دور، فروری ۲۰۱۸ء کے شمارے پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر حسانی القاسمی کا تبصرہ

پوری اردو دنیا میں 'نیا دور' کے نام سے معروف اس رسالے کا ایک خاص انداز رہا ہے اور اس نے ماضی میں جتنے بھی خصوصی شمارے شائع کئے ہیں ان کی دستاویزی اہمیت مسلم ہے۔ پہلے یہ رسالہ کتابت کے ذریعہ شائع ہوتا تھا مگر اب اس رسالے کی برقی کتابت ہوتی ہے۔ گزشتہ چند مہینوں میں سہیل وحید کی ادارت میں اس رسالے کا انداز بہت حد تک تبدیل ہوا ہے اور اس تبدیلی کو قارئین نے پسند بھی کیا ہے۔ اس کا تازہ شمارہ معاصر اردو شاعری کے دو اہم تخلیق کاروں سے متعلق ہے۔ ان میں ایک ندا فاضلی جیسے منفرد شاعر و ادیب ہیں جن کا 2016 میں انتقال ہوا تھا اور دوسرے بشیر بدر جیسے مقبول شاعر ہیں جو بستر علالت پر ہیں۔ ان دونوں اہم تخلیقی شخصیات سے منسوب اس رسالے میں بہت ہی اہم اور مقتدر شخصیات کی تحریریں ہیں۔ جن سے دونوں نابھہ فنکاروں کے فن اور شخصیت کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے۔ ندا فاضلی کے حوالے سے ان کی شریک حیات ماسٹی جوشی کا بہت ہی خوبصورت مضمون شامل ہے۔ جس میں انہوں نے ندا فاضلی کے ساتھ اپنے گزرے ہوئے لمحوں کو سیٹھتے ہوئے ندا فاضلی سے ملاقات اور ان کی پسند و ناپسند کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ میرے آنے کے بعد انہوں نے دنیا داری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اپنے کام میں پوری طرح سے ڈوب گئے تھے۔ وہ کبھی کسی کے یہاں شادی یا پارٹی میں نہیں جاتے تھے۔ لکھنے کا ان کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ کبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، کبھی ٹی وی دیکھتے دیکھتے اچانک فون کر کے کسی پروڈیوسر یا میوزک ڈائریکٹر سے کہتے یہ نیا مکھڑا ہے یا نیا انٹرا اس میں ڈال سکتے ہیں۔ ماسٹی جوشی کے علاوہ سلام بن رزاق، عتیق اللہ، شکیل اعظمی، مظہر احمد، شاہنواز قریشی، حسن کاظمی، زیبا محمود، عائشہ ضیاء کی تحریریں بھی ندا فاضلی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے شامل ہیں۔ سلام بن رزاق نے ان کی نثری کتابوں 'ملاقاتیں'، 'چہرے' اور 'دیواروں کے بچے' کے حوالے سے لکھا ہے جس کی قرأت سے پتہ چلتا ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی لا جواب تھی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ندا فاضلی کی خودنوشت 'دیواروں کے بچے' کا مریوط اور منطقی تجزیہ کرتے ہوئے سوانحی ناولوں میں دیواروں کے بچے کے امتیازات کو واضح کیا ہے۔ اس سوانحی ناول کے حوالے سے یہ بہت اہم تحریر ہے۔ شکیل اعظمی نے ندا فاضلی سے

اپنے تعلقات کی پوری کہانی لکھی ہے۔ یہ ایک اچھا تاثراتی مضمون ہے جس سے ندا فاضلی کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مظہر احمد نے ندا فاضلی کی نثر نگاری کی تفہیم کے حوالے سے ان کی خودنوشت 'دیواروں کے بچے' پر مرکوز رہ کر ان کے مخصوص نثری اسلوب کی داد دی ہے۔ شاہنواز قریشی نے اپنے مضمون میں یہ واضح کیا ہے کہ ندا فاضلی نے شاعری میں ایک نئی زمین تلاش کی ہے اور وہ کسی اسلوب کے اسیر نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا ایک مخصوص لہجہ ہے اور اسی سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کے اشعار ان کا نام لیے بغیر لکھ دیے جائیں تو اس کا لہجہ بتا دیتا ہے کہ یہ اشعار ندا فاضلی کے ہیں۔ حسن کاظمی نے بھی ندا فاضلی سے اپنے تعلقات کی داستان تحریر کی ہے اور ان کی شخصیت کے کئی اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ عائشہ ضیاء نے ندا فاضلی کی شاعری کے امتیازی پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی لفظیاتی و موضوعاتی انفرادیت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ندا لوک ادب ہندی کلاسیکی اور اردو کی روایت کو ہم آمیز کرنے کا ہنر ندا فاضلی کے کام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے اور اس میں کچھ نثری تحریریں بھی ہیں۔ ندا فاضلی کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جو سہیل وحید نے ان سے لیا تھا۔ جس میں ندا فاضلی نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ اردو ہندی دونوں زبانوں کا علاقہ ایک ہی ہے۔ امیر خسرو کے زمانے میں ہندی اور اردو کا جھگڑا ہی نہیں تھا۔



معروف اور مقبول شاعر بشیر بدر کے کے حوالے سے 'نیا دور' میں جو تحریریں شامل ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔ اس میں بشیر بدر کی شریک حیات محترمہ راحت بدر کا انٹرویو بھی شامل ہے۔ جس سے بشیر بدر کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے بہت اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ انٹرویو سہیل وحید نے لیا ہے۔ راحت بدر نے اپنے انٹرویو میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ بشیر بدر محبت کے شاعر تو ہیں ہی اس کے علاوہ اپنی مٹی سے جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ آسان زبان میں بڑے بڑے مضمون کو باندھنا اور عوام کے دل و دماغ میں بیٹھا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وسیم بریلوی نے بشیر بدر کے حوالے سے لکھتے ہوئے جہاں مشاعروں میں اپنی رفاقت اور تعلق کا ذکر کیا ہے وہیں اس بات کا بھی اعتراف کیا

ہے کہ بشیر بدر کی غزل اس نمناک غنائیت کی سبک رومی کا نام ہے جسے کوئی شعری عہد اپنے سفر کا عنوان بنانے میں فخر محسوس کرے گا۔ انہوں نے لفظ کی بنیاد پر طاقت کی انتہاؤں کو حساس فکر کی انگلیوں سے کچھ ایسے چھوا اور ایسی شعری فضا بنائی کہ بشیر بدر کا گھور مخالف بھی دانتوں میں انگشت اعتراف دبائے بغیر نہیں رہتا۔ شاعر فتح پوری نے ان کی شاعری کا بہت عمدہ جائزہ لیا ہے۔ رضیہ حامد نے بشیر بدر کے انفرادی زاویہ نگاہ اور جدید طرز اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بشیر بدر نے عام بول چال کی زبان کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے اور ان کے کلام میں نئی نئی تراکیب اور حسی تازہ سے ہیں جن سے شعریت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اقبال مسعود نے بشیر بدر کی تخلیقیت کو اپنا مرکز بناتے ہوئے بڑی اہم بات کہی ہے کہ بشیر بدر نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندی اور اردو کے درمیان دوستی اور محبت کا ایسا پل تعمیر کیا جس نے غزل کو ایک طرف ہندوستانی بنا دیا تو دوسری طرف پتلی گلی سے نکل کر غزل اس شاہراہ پر رواں دواں ہو گئی جو ملک کے قومی دھارے سے وابستہ تھی اور ہمہ جہتی تہذیب کا کس بن گئی۔ احمد محفوظ نے اکائی سے آمد تک ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ تحریر کیا ہے کہ وہ اس لحاظ سے ممتاز کہے جاسکتے ہیں کہ ان کے کئی اشعار عوامی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مست حفیظ رحمانی نے بشیر بدر کے قیام سیتاپور کے حوالے سے معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ ریشما پروین نے بشیر بدر کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ان کے اکثر اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ نور فاطمہ نے بشیر بدر کی شاعری میں آفاقیت کے عناصر تلاش کئے ہیں۔ قارئین کے درمیان بشیر کی شاعری کی مقبولیت کا راز سادہ و سلیس زبان اور ان کی شاعری کے دھجے لہجہ میں پوشیدہ ہے غالباً اسی سبب ان کے اشعار زبان زد ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اردو کے دو مقبول شاعروں ندا فاضلی اور بشیر بدر کو معنون نیا دور کا یہ شمارہ 96 صفحات پر محیط ہے اور دیدہ زیب کتابت و طباعت سے مزین ہے۔ اس میں قیمت شمارے کی قیمت صرف 10 روپے ہے۔ سہیل وحید جیسے اختراعی ذہن رکھنے والے ادیب کی ادارت میں 'نیا دور' حکومت اتر پردیش کا یہ ادبی و ثقافتی ترجمان ماہنامہ نیا دور شہرت اور مقبولیت کی نئی بلندیاں طے کرتا جا رہا ہے۔

□□□

آپ کے خطوط

نیا دور یوں تو ہمیشہ ہی سے اپنی عمدہ نگارشات اور معیاری مضامین کی وجہ سے اردو کے معیاری و ممتاز رسائل میں سرفہرست رہا ہے۔ اس کے خصوصی شمارے تو دستاویز کا مقام رکھتے ہیں۔ نئی ادارت کے زیر اہتمام اس کے اندر جو نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں، ان سے اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہے۔ فروری کے شمارے کی چکاچوندھ ابھی آنکھوں سے اوجھل بھی نہ ہو پائی تھی کہ مارچ کے شمارے نے آنکھوں کو مزید خیرہ کر دیا۔ ماڈرن آرٹ سے مزین سرورق اپنی دلکشی سے مسحور کر رہا تھا کہ پہلا ورق پلٹتے ہی قلم کار حضرات کے اسماء و مضامین نے دل کو مزید شادمانی عطا کر دی۔ دیکھتے ہی مطالعہ شروع کر دیا۔ پہلے ہی مضمون 'علم الانسان مالم یعلم' نے دل کو موہ لیا۔ اس کے بعد کے مضامین بھی کچھ ایسی ہی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔

مدیر محترم نے مضامین کو منتخب کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں وطن عزیز کی اہم جامعات کے تعلق سے خود ان کے فیض یافتگان کے رشحات قلم یکجا کر دئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ اس حوالے سے ایک خصوصی شمارہ بن گیا ہے۔ (اگر ہو سکے تو کسی شمارے میں ہمدرد یونیورسٹی کے حوالے سے بھی لکھوائیے۔ یہ بھی ہماری ایک عظیم دانش گاہ ہے۔) زیر نظر شمارے میں شامل صالحہ صدیقی کا مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعارف پیش کرتا ہے۔ سید محمد عقیل اور سفینہ بیگم کی تحریر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یاد تازہ کراتی ہیں تو نور فاطمہ کے زرنگار قلم نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں گزارے لمحات کو اس قدر دلنشین و دلآویز انداز میں پیش کیا ہے کہ دل بیتاب ہوا اٹھا کہ ان کی طرز تحریر کی داد دی جائے۔ ثوبان سعید

کے ذریعہ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کا ذکر۔

خیر، ان مضامین کے ذریعہ آپ نے ملک کی اہم یونیورسٹیوں کی سیر کرنے کا سامان فراہم کر دیا اور ہم ایک ہی نشست میں دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے شہروں میں واقع جامعات کی تفریح کرنے کی سعادت حاصل کر سکے۔ پھر قلم کار حضرات کی سحر نگاری کے ہر ہر لہجہ یہی گمان ہوا کہ قاری بذات خود وہاں موجود ہے اور وہاں کے حسین و خوشنما مناظر سے براہ راست لطف اندوز ہو رہا ہے۔ ان مضامین کے ساتھ ہی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، مرزا جعفر حسین، حمید دلوائی، طاعت گل اور نجیب انصاری کے رشحات قلم بھی اس چمن کی گل کاری میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ شاعری کے گوشے میں غزلیات کی شمولیت نے باؤ بہاری کا کام کیا ہے۔ خاص کر اصغر گوٹروی کی غزل 'رنج تھا اسیروں کو بال و پر کے جانے سے' دل کو چھو گئی۔ واقعی نیا دور کے جدید رنگ و ادب اور نئے اسلوب و آہنگ نے اس کے مقام و وقار کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا ہے۔ واقعی اس کے مضامین و مندرجات قاری کے ذہن و دل کو تابانیاں اور قلب و ذہن کو جولانیاں عطا کرتے ہیں۔ اس کے لئے جہاں اس کے جملہ اہل قلم حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ وہیں مدیر محترم اپنی تمام ٹیم کے ساتھ اس تحسین و ستائش کے حقدار ہیں جو ان کا جائز و واجب حق ہے۔

راقم الحروف آپ کے حضور تحسین و ستائش اور امتنان و تشکر کے چند الفاظ پیش کرنا اپنا ذوق علمی اور فرض ادبی محسوس کر رہا ہے۔ اس لئے سطور ہذا آپ کے نذر کر رہا ہوں۔ 'گر قبول افتد زہے عز و شرف' دعا ہے کہ اردو کی یہ شمع نورانی اپنی تجلیات اور جملہ رنگ و بو اس جہان علم و ادب پر اسی طرح ضوفشاں رہے اور ہم تشنگان ادب کو اس کی نورانیت

سے اپنے اذہان و قلوب کو منور کرنے کی صلاحیت عطا ہوتی رہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمن عاکف سنبھلی
ایم جی ایم (پی جی) کالج، سنبھلی

مئی ۲۰۱۸ء کا نیا دور موصول ہوا۔ اردو ادب کے مایہ ناز قلم کاروں من جملہ سلام بن رزاق، مرزا جعفر حسین وغیرہ کی تحریروں سے مزین۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ داؤد احمد نے اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور کافی حد تک معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو ادب میں مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ زین الدین حیدر کا مضمون 'آغا حشر کاشمیری ملقب بہ انڈین شیکسپیر، عظیم ڈرامہ نگار، اداکار اور شاعر' بھی کافی حیران کن ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی شخصیت کہیں گم سی ہو گئی ہے۔ جب ان میں اتنی خوبیاں تھیں کہ وہ بیک وقت ڈرامہ نگار، اداکار اور شاعر بھی تھے تو ان پر تحقیق کے لئے اداروں کو آگے آنا چاہئے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کے علاوہ کچھ نئے نکات کو بھی ان کی نظم اور نثر نگاری سے اخذ کیا جاسکتا ہے تاکہ ان کی خصوصیات اور صلاحیتیں مزید واضح ہو سکیں۔ افسانوں کا حصہ مکمل طور پر متاثر کرتا ہے۔ سلام بن رزاق، تبسم فاطمہ، محمد قمر سلیم، عارف محمود، عبدالصبور قدوائی، گل جبین اختر وغیرہ کے افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ باز دید اور گزشتہ لکھنؤ تو ایک نئی کھوج سی ہے۔ ساجدہ زیدی کی نظمیں کافی مشہور ہیں۔ رسالے میں شائع نظم 'فقیری میں' کافی عمدہ ہے اور غزلیں بھی بہتر ہیں لیکن غزل اور نظم انتخاب اس سے بہتر ہو سکتا تھا۔ رسالے میں شامل غزلیں بھی اچھی ہیں خاص کر مناظر حسن شاہین کی غزل بہترین لگی۔ باقی رسالہ بھی عمدہ ہے۔

تحسین مہدی

بارہ بنگی، یو پی



وزیراعظم جناب نریندر مودی لکھنؤ میں وزیراعظم رہائشی اسکیم، امرت اسکیم
اور اسمارٹ شٹی مشن کی تیسری سالگرہ کے موقع پر انعام سے نوازتے ہوئے (۲۸ جولائی ۲۰۱۸ء)

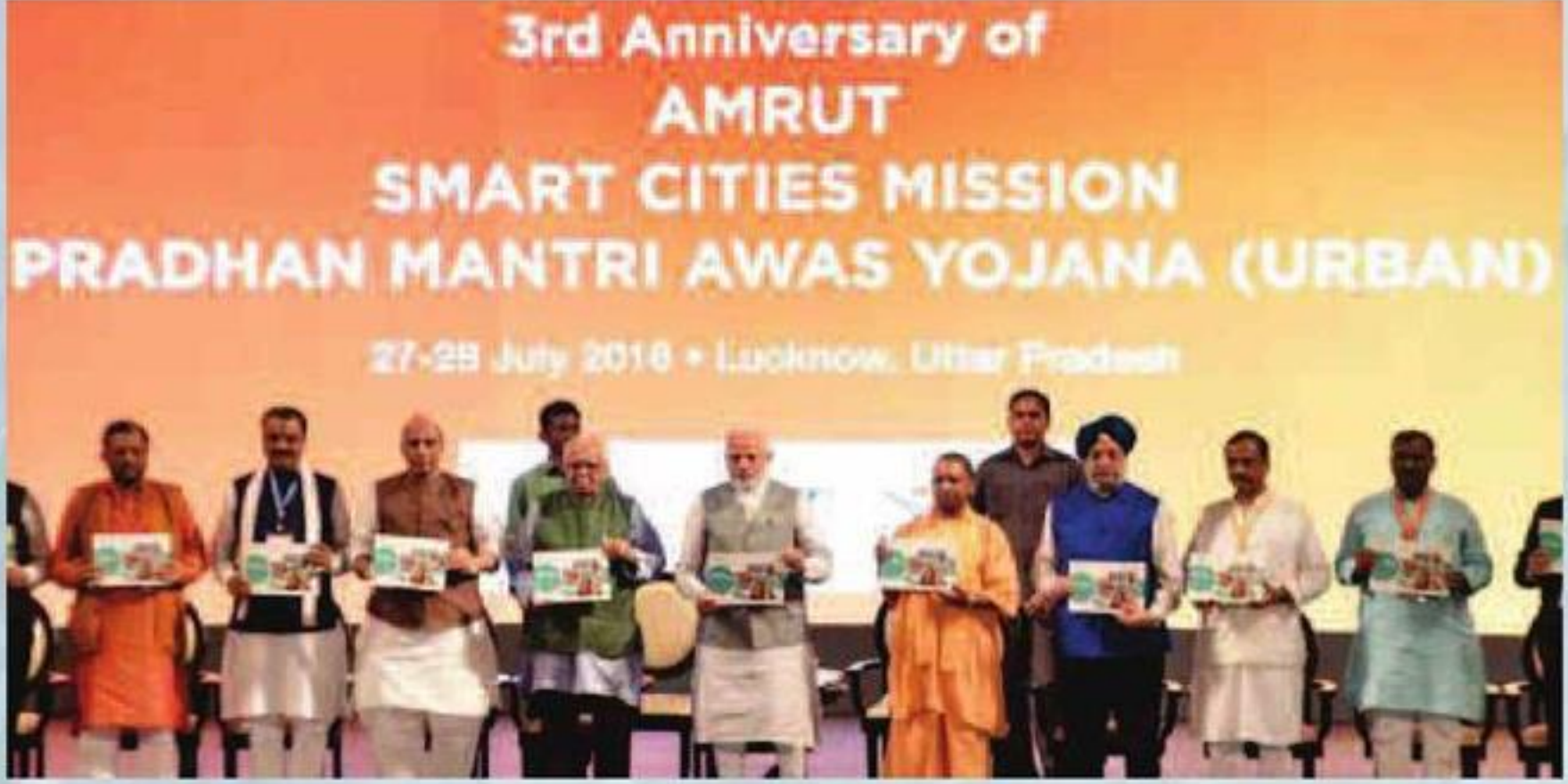


اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کارگل شہید اسمرتی وائی کا لکھنؤ میں
کارگل دہجے دیوس کے موقع پر منعقد پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے (۲۶ جولائی ۲۰۱۸ء)



اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی ضلع لہ میں
اسکول کے بچوں کو نصابی کتب اور اسکول بیگ تقسیم کرتے ہوئے (۲۳ جولائی ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ - 226 001



وزیراعظم جناب نریندر مودی لکھنؤ میں منعقد گراؤنڈ بریکنگ سرمنی میں وزیراعظم رہائشی اسکیم، امرت اسکیم اور اسمارٹ شہر مشن کی تیسری سالگرہ پر ترقیاتی کاموں کی تفصیل کے سلسلہ میں شائع کتاب کا اجراء کرتے ہوئے (۲۸ جولائی ۲۰۱۸ء)



اتر پردیش کے گورنر جناب رام ناٹیک کی صدارت میں راج بھون، لکھنؤ میں منعقد
رام پور رضالا بحری کی ۳۸ ویں میٹنگ میں نیوز لیٹر کے ایک مجموعہ کا اجراء کیا گیا (۱۷ جولائی ۲۰۱۸ء)

वर्ष : 73 अंक 03
जुलाई 2018
मूल्य : 15 रु./-
वार्षिक मूल्य : 165 रु./-

प्रकाशक व मुद्रक, डॉ० उज्ज्वल कुमार, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ-226001 से प्रकाशित-सम्पादक, सुहेल वहीद